لدھیانوی

مطالعہ



مخمور سعیدی

ساحر لدھیانوی

ایک مطالعہ

ساحر
ایک نظر میں

نام : عبدالحیٔ۔

ولادت : ۸ مارچ ۱۹۲۱ء، بمقام لدھیانہ۔

تعلیم : مالوہ خالصہ ہائی اسکول لدھیانہ اور گورنمنٹ کالج لدھیانہ۔

تصانیف : (۱) "تلخیاں" جعلی ایڈیشنوں کے علاوہ، ساحر کی اجازت سے اس کے دو درجن ایڈیشن اردو میں اور ایک درجن ایڈیشن ہندی میں شایع ہوئے۔

(۲) "پرچھائیاں" —— طویل نظم جو امنِ عالم کے موضوع پر ہے۔

(۳) "آؤ کہ کوئی خواب بُنیں" کلام کا دوسرا مجموعہ۔

(۴) "گاتا جائے بنجارہ" —— گیتوں کا مجموعہ۔

اعزاز و اکرام : ۱۹۷۰ء میں ان کی پرانی درس گاہ گورنمنٹ کالج لدھیانہ کی طرف سے گولڈ میڈل دیا گیا۔

۱۹۷۱ء میں حکومتِ ہند کی طرف سے پدم شری کا خطاب ملا۔

۱۹۷۲ء میں "آؤ کہ کوئی خواب بُنیں" پر سوویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ، اردو اکیڈیمی ایوارڈ اور مہاراشٹر اسٹیٹ لٹریری ایوارڈ حاصل کیے۔

۱۹۷۵ء میں سول لائنز لدھیانہ کی ایک سڑک کا نام ساحر لدھیانوی مارگ رکھا گیا۔

ساحر کی تینوں کتابوں کے کئی غیر ملکی زبانوں میں تراجم ہوئے ہیں۔

وفات : سنیچر، ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۰ء بعمر ۵۹ سال، ۷ ماہ، ۱۷ دن۔

ساحر لدھیانوی

ایک مطالعہ

مخمور سعیدی

ناشر

موڈرن پبلشنگ ہاؤس

۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

پہلی بار: اپریل ۱۹۸۱ء
قیمت: تیس روپے
کتابت: جمال گیاوی
طباعت: نعمانی پریس دہلی
سرورق: رزاق ارشد

زیرِ اہتمام:
پریم گوپال متل

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۲-۱۱۰۰۰۲

ساحر

کی سرزمینِ پنجاب کی ادب دوست شخصیت

جنابِ نند کمار گپتا کی نذر

مُندرجات

مرتّب کی طرف سے

رُوبرُو

(شخصیت پر مضامین)

فکر و فن

(شاعری پر مضامین)

پرتوِ خیال

(شاعری کا انتخاب)

مُرَتّب کی طَرَف سے

ساحر کی شاعری کا مطالعہ

ان کی زندگی کے پس منظر میں

مخمور سعیدی

ایسی شخصیتیں کم ہوتی ہیں جن کے کارناموں کی وقعت اور شہرت ان کی زندگی ہی میں انھیں ہر دل عزیز بنا دے اور ہزاروں لاکھوں دلوں پر ان کی حکمرانی ہو جائے۔ ساحر لدھیانوی ایک ایسی ہی شخصیت کا نام تھا۔

ساحر کا شاعرانہ مرتبہ اختلافی بحث کا موضوع بن سکتا ہے لیکن یہ دعویٰ بلا خوفِ تردید کیا جا سکتا ہے کہ اپنے ہم عصروں میں انھیں سب سے زیادہ عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کی اکثر نظمیں، غزلیں اور گیت، بالخصوص نظمیں نوجوان نسلوں کا عزیز ترین ذہنی سرمایہ رہی ہیں۔ یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ ان کی شاعرانہ مقبولیت

فلموں سے ان کے تعلق کی دین تھی۔ فلموں سے ان کی دل چسپی ۱۹۴۵ء میں شروع ہوئی جب وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ ان کی فلم (آزادی کی راہ پر) کے گیت لکھنے کے لیے لاہور سے بمبئی آئے اور فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے ان کی شہرت کا آغاز تو اس کے بھی لگ بھگ نو دس سال بعد ہوا جب انھوں نے فلم بازی کے لیے گیت لکھے۔ شاعرانہ مقبولیت کے منصب پر وہ اس سے پہلے فائز ہو چکے تھے۔ پرست لڑی کے ادارے سے جب ان کا پہلا مجموعۂ کلام تلخیاں شایع ہوا (۱۹۴۴ء) تو اس کی اکثر نظمیں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئیں۔ ان کی آواز ایک ایسے ناکام عاشق کی آواز تھی جسے آزادی اور انصاف کی قدریں بھی دل و جان سے عزیز تھیں۔ وہ غیر ملکی حکومت کے جبر اور اس زوال آمادہ جاگیردارانہ سماج کی ناانصافیوں سے جس میں وہ جی رہا تھا، نجات کا خواہاں تھا۔ اس کی نظر میں انسانی عدم مساوات کے اصول پر عامل وہ طبقاتی سماج جسے بیرونی حکمراں اپنی خود غرضانہ سیاسی مصلحتوں کی تکمیل کے لیے قائم و دائم رکھنا چاہتے تھے، بہتر زندگی کی اُمنگوں اور ایک خوبصورت مستقبل کے خوابوں کا قاتل اور خود اُس کے نجی المیے کا بھی ذمہ دار تھا۔ ساحر نے اپنی شاعری کے وسیلے سے نوجوان نسل کو استحصال پسند بیرونی حکمرانوں اور خود اپنے ملک کے انصاف دشمن سماج کے بے حس ٹھیکیداروں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے کا پیغام دیا اور اس پیغام میں چونکہ شاعر کے اپنے ناکام عشقیہ تجربات کی کسک بھی شامل تھی اس لیے یہ اپنے اندر غضب کی اپیل رکھتا تھا۔ تلخیاں کو بلاشبہ اس دور کا مقبول ترین شعری مجموعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ساحر کی زندگی میں ان کی اجازت سے اس کے دو درجن ایڈیشن شایع ہوئے جبکہ کئی پبلشر ساحر کی اجازت کے بغیر بھی نفع اندوزی کے لیے اسے چھاپتے رہے۔

شورش کاشمیری کے مطابق ساحر نے جب سیاست سے دل چسپی لینی شروع کی تو ابتداءً وہ احرار کی تحریک سے متاثر تھے۔ پھر وہ آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے توسل سے، جو کمیونسٹ پارٹی کی ایک محاذی تنظیم تھی، کمیونسٹ پارٹی کے قریب آئے اور اس پارٹی کی سرپرستی میں قایم ہونے والی ایک دوسری

محاذی تنظیم انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرگرم رکن بن گئے۔ انہی دنوں انھیں لاہور سے شایع ہونے والے مشہور جرائد ادبِ لطیف، سویرا، اور شہکار کی ادارت کے مواقع ملے۔ اور جلد ہی ان کا شمار پہلی صف کے ترقی پسند شاعروں میں ہونے لگا محترمہ ناز صدیقی نے اپنی کتاب ساحر —— شخص اور شاعر میں ایک واقعہ درج کیا ہے جسے یہاں نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

"اکتوبر ۱۹۴۵ء میں حیدرآباد میں اردو کے ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس منعقد کی گئی ساحر کو اس کانفرنس کے لیے خاص طور پر مدعو کیا گیا اور خواہش کی گئی کہ وہ کانفرنس کے لیے مقالے لکھیں۔ کانفرنس کے منتظمین اور شہر کا ساحر کی شہرت سے متاثر تھے لیکن شخصی طور پر ان سے متعارف نہیں تھے۔ ساحر کانفرنس میں شرکت کے لیے پہنچے تو ۲۳، ۲۴ برس کے نوجوان کو دیکھ کر سب حیرت زدہ رہ گئے کیونکہ ان کی تحریروں سے یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ وہ پختہ عمر کے ادیب ہوں گے۔"

(صفحہ: ۱۹)

ساحر، جیسا کہ اوپر کہا گیا، فلم کے گانے لکھنے کے لیے اپنے ایک فلم ساز دوست کے ساتھ اسی سال (۱۹۴۵ء) پہلی بار بمبئی گئے تھے لیکن تقسیم ملک کے وقت انھیں بمبئی چھوڑنا پڑا۔ بمبئی سے دلّی، دلّی سے لاہور اور وہاں سے پھر دلّی پہنچے۔ دلّی سے انھوں نے حالی پبلشنگ ہاؤس کے بدر صاحب اور محمد یوسف جامعی صاحب (اب دونوں مرحوم ہو چکے ہیں) کے تعاون سے ماہنامہ شاہراہ کا اجرا کیا۔ ساحر اس رسالے کے ایڈیٹر تھے اور پرکاش پنڈت اسسٹنٹ ایڈیٹر۔

یہ رسالہ کئی برس تک شایع ہوتا رہا لیکن ساحر زیادہ دن اس سے وابستہ نہ رہے۔ وہ ۱۹۴۹ء کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی مشہور کانفرنس میں، جو بھیمڑی کے مقام پر ہوئی تھی اور اسی سے موسوم ہے، شرکت کے لیے گئے تو پھر دلّی واپس نہ آئے اور دوبارہ بمبئی کا رُخ کیا۔

حاصلِ کلام یہ کہ ساحر نے جب فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے اپنا کیریر شروع کیا تو وہ ایک ممتاز ادیب اور شاعر کا درجہ حاصل کر چکے تھے اور ان کی شاعری قبولِ عام کی سند پا چکی تھی۔ ایک اور پُرلطف واقعہ جو کرشن ادیب نے اپنے مضمون —— ساحر —— میرا بھائی: میرا دوست میں لکھا ہے یہں نقل کرتا ہوں:

"میرے اور ساحر کے مشترک دوست موہن سہگل کے ایما پر ساحر، میوزک ڈائرکٹر ایس۔ ڈی۔ برمن کے پاس گئے۔ برمن نے گانے کی دُھن اور فلم کی سچویشن بتائی۔ ساحر نے وہیں بیٹھے بیٹھے چند لمحوں میں گانے کے بول لکھ دیے:

ٹھنڈی ہوائیں، لہرا کے آئیں

برمن گیت سُن کر بہت خوش ہوئے اور ساحر کو اپنے ہمراہ کاردار اسٹوڈیوز لے گئے تاکہ ساحر کو کاردار صاحب اور دوسرے لوگوں سے متعارف کرا سکیں۔ اسٹوڈیو میں کاردار کے علاوہ شکیل بدایونی اور راجندر کرشن تشریف فرما تھے۔ وہ ساحر کو دیکھ کر احتراماً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ برمن کو تعارف کرانے کا بھی شرف حاصل نہ ہوا کیونکہ وہ سب لوگ ساحر سے مکمل طور پر آشنا تھے۔ برمن دا کو یک گونہ مسرت

کا احساس ہوا کہ ان کا کوئی ساحر لدھیانوی
بہت بڑا کوی ہے۔ اپنی نگاہِ انتخاب پر انھیں
فخر محسوس ہو رہا تھا۔"

("ساحر لدھیانوی" شایع کردہ محکمۂ السنۂ پنجاب۔ ص: ۱۷)

ساحر اپنے خیالات میں کتنے راسخ اور اپنے فن کے ساتھ کتنے مخلص تھے اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ فلموں کے لیے گیت لکھنے والے بعض دوسرے شاعروں کے برعکس جو ترقی پسندی کے بھی دعویدار تھے، ساحر نے اپنی سطح سے نیچے اتر کر گیت لکھنا بہت کم گوارا کیا اور فلمی گیتوں کو وہ ادبی معیار دینے کی کوشش کی جو انھیں عزیز تھا۔ انھوں نے گیتوں کو محض دل بہلاوے کی چیز نہ سمجھتے ہوئے ان میں معنویت اور مقصدیت کی خوبی پیدا کی۔ یہ کام آسان نہ تھا۔ ان سے پہلے فلموں کے لیے گیت لکھنا شاعروں کے لیے بس ایک کاروباری مشغلہ تھا اور آرزو لکھنوی کے استثنیٰ کے ساتھ اکثر شاعر ایسے گیت لکھتے رہے تھے جو سننے والوں کے لیے محض سطحی اور سستی تفریح کا سامان فراہم کر سکیں۔ دوسروں کا تو ذکر ہی کیا جوش ملیح آبادی جیسا بغاوت اور انقلاب کا پیغام دینے والا شاعر اس طرح کے مبتذل گیت لکھ چکا تھا:

پاپی جُبنا کا دیکھو اُبھار
جیسے گیند دا کھِلے
جیسے لٹّو ہِلے
جیسے گدر انار

(فلم: مَن کی جیت)

ساحر نے فلموں میں رہ کر "رات بھر کا ہے مہماں اندھیرا" "تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا" "وہ صبح کبھی تو آئے گی" اور دوسرے بے شمار گیت لکھے جو زندگی، اور انسانیت کے لیے ایک اُمید پرور بشارت، ایک خوش گوار نوید بن کر فضا میں گونجے اور مدتوں گونجتے رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اس کتاب میں ان

کے فلمی نغموں پر بھی ایک مضمون جو اُن کے قریبی دوست اور ساتھی جاں نثار اختر مرحوم کے قلم سے ہے، اور ان کے شعری انتخاب میں ان کے منتخب فلمی گیتوں کو بھی شامل کرنا ضروری سمجھا۔ خود ساحر بھی اپنے فلمی گیتوں کو اہمیت دیتے تھے۔ اس کا شاہد ان کے گیتوں کا مجموعہ گاتا جائے بنجارہ ہے جو اُن کے ایما اور اجازت سے شایع کیا گیا تھا۔

بعض لوگوں کے اس اعتراض کا وزن میں محسوس کرتا ہوں کہ ساحر کے بہت سے گیت ایسے ہیں، جو گیت نہ رہ کر نظم یا غزل کا رُوپ دھار لیتے ہیں۔ ان کی ساخت ایک منطقی تنظیم لیے ہوئے ہے جو گیت کے لچکیلے مزاج کے منافی ہے۔ لیکن جہاں تک منطقی ذہن کی کارفرمائی کا تعلق ہے اس کا سایہ تو ساحر کی پوری شاعری پر صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ ساحر کی شاعری کی دل پذیری کی ضامن احساس اور تاثر کی شدت ہے اور اس وصف سے ان کے گیت بھی متصف ہیں۔

فلمی شاعر کی حیثیت سے ساحر کا ایک کنٹری بیوشن یہ بھی ہے کہ انھوں نے فلمی گیت کاروں کا وقار بڑھایا اور اس حقیقت پر اصرار کیا کہ موسیقار دُھن کتنی ہی دلکش تیار کرے، بول بے جان ہوں تو گیت دیرپا مقبولیت حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ بڑے موسیقاروں کے لیے ایک چیلنج تھا اور اس کے نتیجے کے طور پر ساحر فلموں سے بے دخل بھی کیے جا سکتے تھے لیکن ان کی شاعرانہ شخصیت اپنا لوہا منوا چکی تھی انھوں نے کئی غیر معروف موسیقاروں کے ساتھ گیت لکھے اور ان گیتوں نے ہر طرف دھوم مچا دی۔

ساحر جب فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے صدر منتخب ہوئے تو انھوں نے ایک اور حق تلفی کے خلاف آواز بلند کی۔ یہ حق تلفی ریڈیو کے محکمے کے کرتا دھرتا برسوں سے روا رکھتے آرہے تھے۔ گیت کے ساتھ گیت کار کا نام نشر نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ ساحر ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ناانصافی کا یہ سلسلہ رکا اور گیت کے ساتھ گیت لکھنے والے کا نام بھی لوگوں تک پہنچنے لگا۔

ساحر کا ایک شعر ہے جو اُن کے پہلے مجموعۂ کلام تلخیاں کے اوّلین

ایڈیشن سے اس کے آخری ایڈیشن تک، کتاب کے کسی ابتدائی صفحے پر متواتر شایع ہوتا رہا ہے:

دُنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہُوں میں

اس شعر کو بجا طور پر ساحر کی طرف سے اپنی کتاب کا دیباچہ قرار دیا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے وضاحت کے ساتھ اپنی شاعری کی حدیں متعین کر دی ہیں اور اپنے شعری رویّے کا بھی قطعیت کے ساتھ اظہار کر دیا ہے۔ ندا فاضلی کو انٹرویو دیتے ہوئے ان کے ایک سوال کے جواب میں بھی ساحر نے یہی کہا تھا کہ نہ صرف ان کی شاعری ان کی اپنی زندگی کا عکس اور ان کی اپنی شخصیت کا اظہار ہے بلکہ وہ سچا ادب اسی کو سمجھتے ہیں جس کا منبع لکھنے والے کے ذاتی تجربات و مشاہدات کے سوا کہیں اور نہ ہو۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

اچھی شاعری بھلے ہی کسی مخصوص نظریے پر پوری نہ اُترتی ہو لیکن اس سے اس کی عظمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ڈاکٹر اقبال سے شدید ترین نظریاتی اختلاف کے باوجود میں اُن کی شاعرانہ عظمت کا معترف ہوں۔ لکھتے وقت ادیب کو اپنی شخصیت کے ساتھ سچا رہنا چاہیے۔ جو کچھ بھی کہا جائے اس میں ضمیر کی شرکت ضروری ہے یعنی اندر سے بھی کچھ ایسا لگتا ہو نہیں تو ان کہی بات اندر ہی اندر گولا بن جائے گی جو تکلیف دے گی۔ شعر کہنے کے بعد اس پر کون سا لیبل چسپاں کیا جائے، یہ ادیب کی نہیں، لیبل فروشوں کے سوچنے کی

بات ہے۔ ادب درحقیقت شخصیت کے اظہار
کا نام ہے۔ یہ ایک نفسیاتی عمل ہے۔ اگر ادیب اپنے
مذاق کے خلاف کسی نیل کے لیے لکھتا ہے تو
اندر سے کوئی تسکین نہیں ہوگی۔"
("ملاقاتیں" ص: ۱۲۳)

ساحر کے اس موقف کی روشنی میں، جس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ساحر شاعرانہ صلاحیت کے ساتھ ساتھ تخلیقی عمل کو سمجھنے اور پرکھنے والی نظر بھی رکھتے تھے، یہ ناگزیر ہے کہ ان کی شاعری کے مرکزی میلانات کا سرچشمہ کہیں اور نہیں، ان کی زندگی میں تلاش کیا جائے۔ اس تلاش کے نتائج ساحر کے ادعا کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا ساحر اپنی ادبی زندگی کے آغاز ہی میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوگئے تھے۔ یہ تحریک کچھ واضح اور طے شدہ سیاسی اور ادبی تصورات کی حامل تھی لیکن ساحر ان تصورات کے موید ہوتے ہوئے بھی اپنی شاعری میں ان بندھے ٹکے موضوعات کے دائرے کے اسیر کبھی نہیں رہے جن پر اس تحریک کے قائد زور دیتے رہے ہیں۔ ان کے فکر و فن کو سمجھنے کے لیے کسی سیاسی یا سماجی فلسفے میں سر کھپانے کی بجائے خود ان کی زندگی اور ان کی شخصیت سے قریبی شناسائی زیادہ مفید ہوگی۔

ساحر لدھیانے کے ایک بڑے زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے ان کے والد چودھری فضل محمد کا شمار شہر کے معروف اور معزز لوگوں میں تھا مگر ان میں وہ تمام خامیاں موجود تھیں جو اس طبقے کی پہچان بن چکی تھیں جس کی وہ نمائندگی کرتے تھے۔ انھوں نے یکے بعد دیگرے کئی شادیاں کیں لیکن کسی بیوی سے لڑکا پیدا نہیں ہوا اور کہا جاتا ہے کہ اولادِ نرینہ کی خواہش ہی میں وہ شادی پر

شادی کرتے چلے گئے۔ ساحر کی والدہ سردار بیگم ان کی گیارہویں بیوی تھیں اور وہ اس رشتے کو عام لوگوں سے خفیہ رکھنا چاہتے تھے۔ اس اخفا کی وجہ یہ تھی کہ ساحر کی والدہ کو وہ خاندانی لحاظ سے اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتے تھے اور اسے اپنے سماجی رتبے سے فروتر خیال کرتے تھے کہ ان سے علی الاعلان رشتۂ ازدواج قائم کریں۔ دوسری طرف ساحر کی والدہ بجا طور پر یہ چاہتی تھیں کہ رشتہ قائم ہوا ہے تو اس کا برملا اعلان بھی ہو اور ان کی نئی حیثیت تسلیم کی جائے۔

ساحر کی ولادت کے بعد سردار بیگم کو مزید اخلاقی تقویت حاصل ہوئی اور وہ اپنا حق منوانے پر اور زیادہ مُصر ہوئیں۔ ویسے بھی اب یہ اُن کا ذاتی مسئلہ نہیں رہ گیا تھا بلکہ اس سے ان کے نومولود بیٹے کا مستقبل بھی وابستہ تھا۔ چودھری فضل محمد کے سر پر خاندانی وقار کا آسیب بدستور منڈلا رہا تھا۔ وہ اپنی نئی بیوی اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والے اپنے اکلوتے بیٹے کو ہر طرح کی مادی سہولتیں فراہم کرنے کو تیار تھے لیکن اس پر بھی بضد تھے کہ یہ سب کچھ پوشیدہ طور پر ہو۔ ان کی یہ ضد ساحر کی والدہ اور خود ساحر کو سماج اور قانون دونوں کی نظر میں بے وقعت کر دینے کے مترادف تھی اس لیے سردار بیگم نے اپنے ضدی شوہر سے ٹکّر لینے کا فیصلہ کیا اور اپنے اور اپنے بیٹے کے جائز حقوق حاصل کرنے کے لیے عدالت کا دروازہ جا کھٹکھٹایا[1]۔ ناز صدیقی کا بیان ہے کہ اس نزاع کا سبب یہ تھا کہ چودھری فضل محمد اپنی موروثی جائداد کو بیدردی سے ٹھکانے لگا رہے تھے اور اپنی زرعی آراضی کوڑیوں کے مول فروخت کر رہے تھے۔ سردار بیگم اس جائداد کا نیا وارث اپنے بیٹے کو سمجھتی تھیں اور اس لیے اس کا تحفظ چاہتی تھیں۔ ایک مرحلے پر ساحر کے والد نے عدالت میں درخواست گزرانی کہ ان کے بیٹے کو سردار بیگم سے لے کر، جو اُن سے علیحدگی اختیار کر چکی تھیں، ان کی سرپرستی میں دے دیا جائے مگر عدالت نے یہ درخواست منظور نہیں کی اور ساحر اپنی ماں کے پاس

---

[1] راوی: گوپال متّل اور ایم، ڈبلیو فاروقی جو ساحر اور اُن کے خاندان کے قریبی شناسا رہے ھیں۔

ہی رہے۔ درخواست کی نامنظوری کا سبب ایک عدالتی سوال کا جواب تھا جو ساحر کے والد نے دیا۔ یہ جواب ان کی مخصوص ذہنیت کا غماز ہے۔ ناز صدیقی کے لفظوں میں:

"پھر جج نے یہ سوال کیا کہ وہ لڑکے کی تعلیم کا کیا انتظام کریں گے تو انھوں نے جواب دیا کہ پڑھائے وہ اولاد کو، جس کو نوکری کروانا ہو۔ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے وہ بیٹھ کر کھائے گا۔ جج نے فیصلہ دیا کہ بچے کو ماں کے ساتھ ہی رکھا جائے کیونکہ وہ تعلیم دلوا رہی ہیں۔ اگر اسے والد کے ساتھ رکھا جائے تو وہ ان پڑھ رہ جائے گا"

("ساحر: شخص اور شاعر" ص: ۱۶)

بہرکیف، ساحر کے والدین کی مقدمے بازی تقسیم ملک تک جاری رہی۔ ساحر والد کے سایۂ شفقت سے دور تنہا والدہ کی سرپرستی میں رہے اور ان کی تعلیم و تربیت کا سارا بار انہی نے اٹھایا۔

ساحر نے مالوہ خالصہ اسکول سے انٹرنس پاس کیا اور پھر گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں داخل ہوئے۔ اس سے پہلے ان کی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ ساحر کے والد انگریز دوست اور حکام رس آدمی تھے لیکن ساحر حکام کی نظر میں ناپسندیدہ شخص ٹھہرے اور غالباً حکام کی ناراضگی کے سبب ہی انھیں بی، اے کے آخری سال

"ساحر ــــــ شخص اور شاعر" ساحر کی زندگی میں شائع ہو کر ان کی نظر سے گزر چکی تھی اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ساحر کے جو سوانحی حالات درج ہوئے ہیں ان پر ساحر کی مہرِ تصدیق ثبت ہے۔

میں نہ صرف کالج چھوڑنا پڑا بلکہ وہ لدھیانے سے لاہور منتقل ہو جانے پر بھی مجبور ہوئے۔ ان کی نظم "نذرِ کالج" میں اس طرف واضح اشارے ملتے ہیں:

ہم ایک خار تھے جو چمن سے نکل گئے
ننگِ وطن تھے، حدِ وطن سے نکل گئے
گائے ہیں اس فضا میں وفاؤں کے راگ بھی
نغماتِ آتشیں سے بکھیری ہے آگ بھی
سرکش بنے ہیں، گیت بغاوت کے گائے ہیں
برسوں نئے نظام کے نقشے بنائے ہیں
معصومیوں کے جرم میں بدنام بھی ہوئے
تیرے طفیل موردِ الزام بھی ہوئے
اس سرزمیں پہ آج ہم اک بار ہی سہی
دُنیا ہمارے نام سے بیزار ہی سہی
لیکن ہم ان فضاؤں کے پالے ہوئے تو ہیں
گر، یاں نہیں تو یاں سے نکالے ہوئے تو ہیں

(تلخیاں ۲۳ واں ایڈیشن، ص: ۲۵، ۲۶)

لاہور پہنچ کر ساحر نے دیال سنگھ کالج میں داخلہ لیا اور اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر چُنے گئے۔ یہاں بھی انھیں امتحان میں بیٹھنے سے قبل ہی کالج چھوڑ دینا پڑا۔ نئے تعلیمی سال میں انھوں نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا مگر ان کی تعلیم کا سلسلہ زیادہ دن نہ چل سکا اور انھوں نے اپنا سارا وقت ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کے لیے وقف کر دیا۔

مُلک کی تقسیم اور آزادی کا اعلان ہوا تو ساحر بمبئی میں تھے اور ان کی والدہ لدھیانے میں۔ فرقہ وارانہ فسادات کی خونی لہر نے پورے مُلک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پنجاب میں اس کا زور کچھ زیادہ ہی تھا۔ لاہور ہندوؤں سے اور لدھیانہ مسلمانوں

سے خالی ہوگیا۔ ان دونوں ہی شہروں سے ساحر کی یادیں وابستہ تھیں۔ ساحر کے والد چودھری فضل محمد اپنے دوسرے اہل وعیال کے ساتھ لائل پور چلے گئے لیکن ساحر کی والدہ سردار بیگم اس ہنگامے میں لاپتہ ہوگئیں۔ ساحر کی پرورش والدہ ہی نے کی تھی اور انھیں لاڈ پیار بھی صرف والدہ ہی کی طرف سے ملا تھا۔ ماں کی گم شدگی ساحر کے لیے بہت بڑا سانحہ تھا مگر قدرت نے ان کی مدد کی اور آخر تلاشِ بسیار کے بعد ان کا پتہ چل گیا۔ وہ لدھیانے کے پناہ گزیں کیمپ میں کچھ دن گزار کر لاہور چلی گئی تھیں اور شورش کاشمیری کے ہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ ساحر لاہور پہنچے اور والدہ کو ساتھ لے آئے۔ لاہور میں ان کے کچھ دوستوں نے انھیں روکنا چاہا مگر وہ نہیں مانے۔

ساحر کی شاعرانہ مقبولیت روز افزوں تھی۔ ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کی کشش بھی بڑھتی گئی۔ وہ مشاعروں میں شریک ہونے سے گریز کرتے تھے لیکن جب بھی وہ شعر وادب کی کسی محفل میں شریک ہوتے آٹوگراف لینے والوں کی بھیڑ انھیں گھیر لیتی۔ ان میں لڑکیاں بیش بیش ہوتیں۔ ان کی شخصیت سے متاثر اور ان کی شاعری کی پرستار بے شمار لڑکیوں میں چند ایسی بھی تھیں جن سے ساحر بھی متاثر ہوئے اور انھوں نے ان کی قربت حاصل کرنا چاہی لیکن بدقسمتی سے ان کا ہر معاشقہ ناکامی پر منتج ہوا۔

ساحر کے معاشقوں کے بارے میں بہت سی روایات ہیں۔ ان روایات کی روشنی میں ساحر کی پہلی محبوبہ غالباً پنجابی زبان کی ایک شاعرہ تھی۔ ساحر کے ساتھ ہی ان کے ایک شاعر دوست رام پال اشک، جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں اور آج کے دراز ریش افسانہ نگار دیوندر ستیارتھی بھی جو خیر سے ابھی سبزہ آغاز تھے، اس شاعرہ پر بری طرح ریجھے ہوئے تھے۔ اس عشق کا کچھ حال گوپال متل صاحب نے اپنی کتاب 'لاہور کا جو ذکر کیا' میں اپنے خاص انداز میں بیان کیا ہے جو اس طرح ہے :

"۔۔۔ یہ عشق ساحر لدھیانوی، دیوندر ستیارتھی اور ایک نوجوان شاعر اشک نے جس کا پچھلے دنوں انتقال ہو گیا، امداد باہمی کے اصول پر کیا تھا۔

۔۔۔ ستیارتھی کے پاس ان دنوں ایک کیمرہ تھا۔ ہر

روز نئے نئے زاویے سے شاعرہ کی تصویریں کھنچنے لگیں۔ ساحر کے پاس کیمرہ نہیں تھا لیکن انھوں نے اپنی پذیرائی کے لیے یہ حربہ ڈھونڈا کہ شاعرہ کے آنریری پبلسٹی ایجنٹ بن گئے۔ وہ اس کی نظموں کے اردو میں ترجمے کرتے اور مختلف جرائد میں انھیں چھپواتے ہی نہیں بلکہ ان پر تعریفی نوٹ بھی لکھتے۔

شاعرہ کا دوپہر کا وقت نسبتاً فراغت کا تھا۔ یہ دوپہر کی دھوپ میں پیدل اس کی کوٹھی پر پہنچتے اور وہ یہ سمجھ کر کہ غریب دھوپ میں چل کر آئے ہیں انھیں شربت پلا دیتی۔ یہ اس بے چاری کے ذہن میں کہاں تھا کہ یہ اس کو شربتِ وصل کا دیباچہ سمجھتے ہیں۔

ساحر اور اشک ستیارتھی سے زیادہ جانباز تھے اور ستیارتھی کی معیت میں دوپہر کے وقت شاعرہ کی کوٹھی پر جانے کے علاوہ وہ رات بھر کوٹھی کا طواف بھی کیا کرتے تھے . . .

جب کافی شام ہو چکتی ساحر اور اشک چل پڑتے اور اگلی صبح ہی آتے۔ صبح آ کر وہ مجھے جگاتے اور اپنی داستان شروع کر دیتے . . . کبھی کبھی مجھے یہ شبہ گزرتا تھا کہ ساحر اس مقولے پر عمل کر رہا ہے کہ حصولِ شہرت کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ اپنے متعلق جتنی غلط فہمیاں پھیلا سکتے ہو، پھیلا دو۔"

(ص: ۸۸)

متل صاحب نے غالباً یہ کہنا چاہا ہے کہ عشق کے معاملے میں نہ ساحر سنجیدہ تھے نہ شاعرہ۔ انھوں نے احتیاطاً شاعرہ کا نام بھی نہیں لکھا ہے لیکن اب کہ شاعرہ نے اپنی خودنوشت سوانح عمری "رسیدی ٹکٹ" میں جو ساحر کی موت سے کچھ پہلے شایع ہو کر ہزاروں لوگوں تک پہنچ چکی ہے، خود ہی ساحر کے عشق کا برملا اعتراف کرلیا ہے تو اس کا نام مخفی رکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس شاعرہ کا نام امرتا پریتم ہے اور امرتا پریتم نے "رسیدی ٹکٹ" میں ساحر کا جس انداز میں ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ساحر کا رویہ جو بھی رہا ہو، امرتا پریتم نے دل کی گہرائیوں سے انھیں چاہا تھا۔ ان کے چند بیانات ملاحظہ ہوں :

بیس اکیس برس کی تھی جب اپنے خوابوں کے شہزادے کا چہرہ اس دھرتی پر دیکھا تھا پھر جیسے ہر روز مجھے آگ کے دریا سے گزرنا پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۷ء میں جب مجھے اکادمی ایوارڈ ملا تو فون پر اس کی خبر پاکر سر سے پیر تک تپنے لگی ــــــ خدایا! یہ نظمیں میں نے کسی انعام کے لیے تو نہیں لکھی تھیں۔ جس کے لیے لکھی تھیں اس نے انھیں پڑھا ہی نہیں اب ساری دنیا بھی پڑھ لے تو مجھے کیا؟

اس دن شام کو پریس رپورٹر آیا۔ فوٹوگرافر ساتھ تھا۔ وہ جب تصویر لینے لگا تو کاغذ سامنے رکھ کر میرے ہاتھ میں قلم دے دیا۔ وہ مجھے فکرِ شعر کے عالم میں دکھانا چاہتا تھا۔ مگر جب قلم کاغذ پر چلا تو کوئی شعر لکھنے کی بجائے اس کا نام کاغذ پر منتقل کرنے لگی جو میری شاعری کا مرکز و محور تھا ــــــ ساحر، ساحر، ساحر

... سارا کاغذ بھر گیا۔

اسی کتاب میں ایک اور موقع پر امرتا پریتم لکھتی ہیں:

ایک دن ساحر آیا تو اسے ہلکا سا بخار چڑھا ہوا تھا۔ اس کے گلے میں درد تھا۔ سانس میں کھنچاؤ کی سی کیفیت تھی۔ اس دن اس کے گلے اور چھاتی پر میں نے وکس ملی تھی، کتنی ہی دیر تک ملتی رہی تھی ——— اور تب مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں اس طرح پیروں پر کھڑے کھڑے پوروں سے، انگلیوں سے اور ہتھیلیوں سے، اس کی چھاتی کو ہولے ہولے ملتے ہوئے اپنی پوری عمر گزار سکتی ہوں۔ میرے اندر کی عورت کو اس وقت (اپنے اظہار کے لیے) کسی کاغذ قلم کی ضرورت نہیں تھی۔

(ص: ۳۹)

اور پھر:

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میرا بیٹا میرے جسم کی آس بنا تھا۔ ۱۹۴۶ء کے آخری دنوں کی بات...

اخباروں اور کتابوں میں کئی بار پڑھا تھا کہ ہونے والی ماں کے کمرے میں جس طرح کی تصویریں سجی ہوں، یا اس کے خیالوں میں جو چہرہ بسا رہے، بچے کی صورت اسی پر جاتی ہے اور میرے

دل نے جیسے دنیا سے چھپ کر سرگوشی میں مجھ سے کہا —— اگر میں ساحر کے چہرے کو ہر لمحہ اپنے خیالوں میں رکھوں تو میرے بچے کی شکل میں اس کی شباہت آجائے گی، جسے زندگی میں نہیں پا سکی تھی، اسے خوابوں میں پا لینے کی ایک کرشمہ ساز کوشش . . .

خدا کی طرح صورت آفرینی کی خلاقانہ کوشش۔

جسم کا ایک آزادانہ عمل۔

صرف روایت ہی سے آزادی نہیں، خون اور نسل کی گرفت سے بھی رہائی

دیوانگی کے اس عالم میں جب ۳ جولائی ۱۹۴۷ء کو بچے کا جنم ہوا اور پہلی بار اس کی شکل دیکھی تو اپنی خلاقی پر یقین آگیا اور بچے کے واضح ہوتے ہوئے خد و خال کے ساتھ اپنا تصور واقعی متشکل ہوتا نظر آیا۔ میرے بیٹے کی صورت سچ مچ ساحر سے ملتی ہے . . ."

(ص: ۱۳۴)

"رسیدی ٹکٹ" میں جہاں جہاں ساحر کا ذکر آیا ہے، میں نے اسے یکجا کر کے ایک مضمون کی شکل دے دی ہے جسے آپ اگلے صفحات میں ملاحظہ کریں گے۔ لاہور کا جو ذکر کیا کہ وہ تمام پیراگراف بھی جن میں ساحر کے لاہور کے شب و روز کا حال بیان ہوا ہے، بہ صورتِ مضمون شاملِ کتاب ہیں۔ دونوں تحریروں کو ایک ساتھ پڑھ کر قارئین خود کسی فیصلے پر پہنچ سکیں گے۔

لتا منگیشکر اور سدھا ملہوترہ کے نام بھی جو فلمی دنیا کی مشہور مغنیائیں ہیں، ساحر سے منسوب رہ چکے ہیں۔ لتا اور اس کی آواز کی جادوگری سے متاثر ہو کر

ساحر نے ایک نظم بھی کہی تھی جو پہلے پہل پرکاش پنڈت کی ادارت میں دلی سے نکلنے والے رسالے فنکار میں شایع ہوئی تھی اور اس کا انتساب تنا کے نام تھا :

یوں اچانک تری آواز کہیں سے آئی
جیسے پربت کا جگر چیر کے جھرنا پھوٹے
یا زمینوں کی محبت میں تڑپ کر ناگاہ
آسمانوں سے کوئی شوخ ستارا ٹوٹے

تُو مرے پاس نہ تھی، پھر بھی سحر ہونے تک
تیرا ہر سانس مرے جسم کو چھُو کر گزرا
قطرہ قطرہ ترے دیدار کی شبنم ٹپکی
لمحہ لمحہ تری خوشبو سے معطّر گزرا!

یہ نظم تلخیاں کے بعد کے اڈیشنوں میں تیری آواز کے عنوان سے شامل ہے مگر انتساب حذف کر دیا گیا ہے۔

تنا کی محبت کی یادگار ساحر کی ایک اور نظم انتظار بھی ہے۔ یہ بھی تلخیاں میں شامل ہے اور فلم میں بھی گائی گئی ہے :

چاند مدھم ہے، آسماں چپ ہے
نیند کی گود میں جہاں چپ ہے

دُور وادی میں دودھیا بادل
جُھک کے پربت کو پیار کرتے ہیں
دل میں ناکام حسرتیں لے کر
ہم ترا انتظار کرتے ہیں

سدھا ملہوترہ کے ساتھ ساحر کا عشق اخباری سُرخیوں کی بھی زینت بنا اور ادبی اور فلمی حلقوں میں مہینوں تک اس کے چرچے رہے لیکن پھر ساحر اور سُدھا کی راہیں الگ الگ ہوگئیں۔ سُدھا نے کسی اور سے شادی کرلی اور ساحر ایک بار پھر تعلق کے موڑ پہ تنہا رہ گئے۔ ان کی مشہور نظم "خوبصورت موڑ" جو بعد میں فلم گمراہ میں گائی گئی۔ اسی ترکِ تعلق کی یادگار ہے۔ یہ نظم بالخصوص اس کا یہ بند:

تمھارے ساتھ بھی پرچھائیاں ہیں اپنے ماضی کی
مرے ہمراہ بھی گزری ہوئی راتوں کے سائے ہیں
تمھیں بھی کوئی اُلجھن روکتی ہے پیش قدمی سے
مجھے بھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ جلوے پرائے ہیں

یہ گواہی دیتا ہے کہ طرفین اپنے اپنے ماضی کے آسیب سے پیچھا نہ چھڑا سکے اور پرانی یادوں کا یہی آسیب جو اپنے دامن میں بہت سی اُلجھنیں لیے ہوئے تھا، بالآخر دونوں کے درمیان علیحدگی کی دیوار بن کر کھڑا ہوگیا۔

ساحر کی زندگی میں جو دوسری لڑکیاں آئیں اُن میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام ہیں، اس لیے ان کے ذکر سے گریز مناسب ہے لیکن ان میں سے ایک خاتون یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ ساحر نے ان سے نکاح کرلیا تھا اور وہ بہت دن تک ساحر کے ساتھ ان کے گھر میں رہی ہیں۔ پھر کچھ اختلافات پیدا ہوئے اور ساحر نے انھیں گھر سے نکال دیا۔ ایسی کوئی شہادت نہیں کہ ساحر نے اس شادی کا اعتراف کیا ہو لیکن اگر ان خاتون کا بیان درست ہے تو کہنا پڑے گا کہ ساحر نے اس معاملے میں اپنے والد جیسا ظالمانہ رویہ ہی اختیار کیا اور عمل کی حد تک اپنے اُن خیالات سے خود ہی منحرف ہوگئے جن کا اظہار عورت کے تئیں اُن کی شاعری میں بارہا ہوا ہے۔ اس کا یقیناً کوئی گہرا نفسیاتی سبب ہوگا۔

ساحر کے بارے میں ان کے بعض دوستوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ بدمزاج تھے لیکن یہ پوری سچائی نہیں۔ آخر عمر میں ان کے مزاج میں ایک چڑچڑاپن ضرور آگیا تھا لیکن

لہ راوی: رحمٰن شنکر محمد الماس، ایم، جامعہ ملیہ، اردو [illegible]

وہ دوستوں کے ہمدرد اور غم گسار بھی تھے ——— اس سلسلے میں ان کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ ان کے طالب علمی کے زمانے کے ساتھی رام پال اشک جن کا اوپر ذکر آ چکا ہے کینسر میں مبتلا ہو گئے۔ ساحر جانتے تھے کہ ان کے دوست کی موت یقینی ہے۔ لیکن بعض لوگوں نے کہا کہ اگر معالجے کے لیے امریکہ بھیجا جا سکے تو اشک شاید بچ جائیں۔ اشک کے مالی حالات کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے۔ ساحر نے تمام اخراجات کا انتظام اپنے ذمے لے لیا اور اشک کو امریکہ بھیج دیا۔ اشک بچے نہیں لیکن ساحر نے حقِ دوستی ادا کیا۔

۱۹۴۹ء میں بھیمڑی کے مقام پر انجمن ترقی پسند مصنفین کی جو کانفرنس ہوئی اس میں تحریک کے قائدوں نے کچھ واضح سیاسی فیصلے کیے۔ تحریک سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں کو ہدایات جاری کی گئیں کہ وہ قلم چھوڑ کر تلوار اٹھالیں اور قومی حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کریں۔ ان ہدایات کی پیروی کے نتیجے میں کئی مصنفین کو قید و بند کے مراحل سے گزرنا پڑا۔ جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند ہونے والے اہلِ قلم میں مجروح سلطان پوری بھی تھے جو ان دنوں اس طرح کے شعر غزل میں کہنے لگے تھے:

امن کا جھنڈا اس دھرتی پر کس نے کہا لہرانے نہ پائے
یہ بھی کوئی ہٹلر کا ہے چیلا مار لے ساتھی جانے نہ پائے

معتبر راویوں کا بیان ہے کہ مجروح کی غیر موجودگی میں ساحر نے جو اُن دنوں خود بھی خاصے پریشان حال تھے ان کے کنبے کی نگہداشت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ جاں نثار اختر سے بھی ساحر کی گاڑھی چھنتی تھی اور ان کے مشکل دنوں میں وہ ان کے لیے بھی کچھ نہ کچھ کرتے رہے۔

بمبئی میں ساحر کی شامیں اکثر دوستوں کے ساتھ ہی گزرتی تھیں اور شام کو یہ محفلیں ان کے گھر پر ہی آراستہ ہوتی تھیں۔ ندا فاضلی کا بیان ہے اور بعض دوسرے لوگ بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ ان محفلوں میں ساحر دوستوں کی خوب خاطر مدارات کرتے تھے۔ قیمتی سے قیمتی شرابیں اور سگریٹ پیش کرتے لیکن جب محفل نشے کے

عروج پر ہوتی تو ساحر کسی نہ کسی بات کو بہانہ بنا کر کسی نہ کسی پر برس پڑتے اور اور کبھی کبھی نوبت دست درازی تک بھی پہنچ جاتی۔ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان لمحات میں دوست اور شناسا تو ایک طرف وہ اپنی ماں اور رشتے کی ان بہنوں تک کا کوئی لحاظ نہ کرتے تھے جو برسوں سے ان کے ساتھ رہ رہی تھیں، لیکن انہی لوگوں کا یہ بیان بھی ہے کہ ان کی یہ جنونی کیفیت عارضی ہوتی صبح تک وہ بالکل نارمل ہو جاتے اور اپنے رویے پر ندامت اور معذرت کا اظہار بھی کرتے۔ کوئی ماہر نفسیات بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ ساحر کا یہ رویہ اس جذباتی ناآسودگی کے اظہار کی ایک صورت تھی، جس کا احساس شراب پی کر زیادہ شدت اختیار کر لیتا ہوگا۔ ورنہ وہ مردم بیزار نہ تھے۔

آئیے اب اس پس منظر کے ساتھ ساحر کے ادبی کردار اور ان کے شعری رویوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

ساحر ایک بڑے زمیندار باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ انھیں والدین کا جتنا لاڈ پیار ملنا، کم تھا۔ لیکن ان کے والد جس طبقاتی معاشرے کی نمائندگی کرتے تھے اس کے کچھ مخصوص آداب تھے۔ غیر انسانی اور جھوٹے طبقاتی وقار پر مبنی۔ ان کے والد کے جذبۂ پدری پر طبقاتی برتری کا یہ پُر فریب احساس غالب آگیا اور یہ چیز باپ بیٹے کے درمیان ایک دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔

طبقاتی درجہ بندی کے خلاف ساحر کی شاعری جس شدید جذبے کی حامل ہے اسے ان کے اسی تجربے کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ عجب نہیں کہ اشتراکی تحریک سے جو ایک غیر طبقاتی عالمی سماج کے قیام کی مدعی تھی، ان کے متاثر ہونے کا سبب بھی اولاً ان کا یہی تجربہ بنا ہو:

میرے ماضی کو اندھیرے میں دبا رہنے دو
میرا ماضی مری ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں

میری اُمیدوں کا حاصل، مری کاوش کا صلہ
ایک بے نام اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں

(نظم : فرار)

یہ بے نام اذیت جو انھیں اپنے ماضی سے ملی تھی، ساحر کا زندگی بھر پیچھا کرتی رہی۔ ان کا ماضی ان کے حال پر متواتر اپنا تاریک سایہ ڈالتا رہا اور وہ اس سے کبھی نجات نہ پا سکے۔ ان کے دل و دماغ پر اذیت ناک ماضی کی اس مضبوط گرفت نے ان کی نفسیات (اور نتیجے میں ان کے تخلیقی عمل) پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے ــــــــ نظم جاگیر اس کی غماز ہے کہ وہ اپنے ماضی کو اپنے لیے ذلت اور اذیت کا باعث کیوں تصور کرتے تھے۔ اس نظم کے تین بند یہ ہیں :

یہ ہمکتے ہوئے پودے، یہ دمکتے ہوئے کھیت
پہلے اجداد کی جاگیر تھے، اب میرے ہیں
یہ چراگاہ، یہ ریوڑ، یہ مویشی، یہ کسان
سب کے سب میرے ہیں، سب میرے ہیں سب میرے ہیں

میں اُن اجداد کا بیٹا ہوں جنھوں نے پیہم
اجنبی قوم کے سائے کی حمایت کی ہے
غدر کی ساعتِ ناپاک سے لے کر اب تک
ہر کڑے وقت میں سرکار کی خدمت کی ہے

. . . .

ہائے یہ شام، یہ جھرنے یہ شفق کی لالی
میں ان آسودہ فضاؤں میں ذرا جھوم نہ لوں
وہ دبے پانو اُدھر کون چلی جاتی ہے
بڑھ کے اس شوخ کے ترشے ہوئے لب چوم نہ لوں

ساحرؔ کا شاعرانہ تخیل انھیں اپنی جاگیر سے کہیں بہت دور لے جاتا ہے جہاں وہ اپنے بزرگوں کو غیر ملکی حکمرانوں کو خوش آمدید کہتے دیکھتے ہیں اور اس کے صلے میں اپنی ہی زمین کے کچھ ٹکڑے بطورِ خیرات پاکر، احسان مندی کے بار سے جھکتے ہوئے بھی۔ محترم اجداد کی اس تکلیف دہ روش پر ان کا دل کڑھتا ہے اور جب انھیں تصوّر یہ منظر دکھاتا ہے کہ غیر ملکیوں کے سامنے سر بسجود ہونے والے ان کے یہی اجداد اپنے ان ہموطنوں پر جو وطن سے غداری کے صلے میں حاصل شدہ ان کی زمینوں پر اپنا خون پسینہ بہاکر انھیں زرخیز بناتے ہیں، کس طرح کا تحکّم روا رکھتے ہیں اور کس طور انھیں پامال کرتے ہیں تو غم و غصّہ کے ساتھ ساتھ ایک شدید ندامت کا احساس بھی ان کے اندر جاگ اٹھتا ہے اور ان کے پورے وجود میں سرایت کر جاتا ہے۔

نظم کے آخری بند تک پہنچتے پہنچتے ساحرؔ جو یہاں ایک نوجوان جاگیردار کی نمائندگی کر رہے ہیں، پھر اپنی جاگیر پر لوٹ آتے ہیں۔ یہ بند جنسی استحصال کے جس مکروہ پہلو کی طرف اشارہ کر رہا ہے وہ بھی ساحرؔ کے احساسات میں ہمیشہ زہریلا نشتر بن کر کھٹکتا رہا ہے۔ ساحرؔ کے حالات پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی ان کا ذاتی مشاہدہ تھا۔ ساحرؔ کے باپ نے پے در پے کئی شادیاں کیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شادیاں وہ اولادِ نرینہ کی خواہش میں کرتے چلے گئے۔ لیکن یہ کوئی آسان نہیں کہ اس کے پیچھے جنسی ہوس کارفرما نہیں تھی اور لڑکا پیدا کرنے کی اس بے لگام خواہش کو بھی جاگیردارانہ معاشرے کی مخصوص ذہنیت کے سوا کوئی دوسرا نام دینا مشکل ہے۔ لیکن جب یہ لڑکا پیدا ہوا تو صرف اس خطا پر کہ جس عورت کی کوکھ سے اس نے جنم لیا تھا وہ ان کی نظر میں خاندانی لحاظ سے ان کی ہمسر نہیں تھی، ساحرؔ کے والد نے اسے راز رکھنا چاہا کہ وہ ان کی منکوحہ ہے اور نوبت میاں بیوی کے درمیان مقدمے بازی تک پہنچی۔ ساحرؔ نے جب ہوش سنبھالا ہوگا اور یہ ماجرا ان کے سامنے آیا ہوگا تو رشتوں کی اس پاکیزگی کی ان کی نظر میں کیا وقعت رہ گئی ہوگی جس کا ڈھنڈورہ مہذب دنیا دن رات پیٹتی رہتی ہے۔ مرد کی ہوسناکی اور اس کے ہاتھوں عورت کی پامالی کا جو تصوّر ساحرؔ کی پوری شاعری میں جاری و ساری ہے اس کی جڑیں یہیں تلاش کی جانی چاہئیں :

مدد چاہتی ہے یہ حوّا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس، رادھا کی بیٹی
پیمبر کی اُمّت، زلیخا کی بیٹی

ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

یہ ساحر کی مشہور نظم "چکلے" کا ایک بند ہے۔ اس نظم کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا پورا معاشرہ ایک چکلے کا منظر پیش کر رہا ہے جہاں عقیدوں کا تقدس رشتوں کا احترام، محبت، مروت کسی کی حیثیت جنسِ تجارت سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

مذہب کو بنیاد بنا کر ایک انسان دوسرے انسان پر جو تشدد روا رکھتا ہے اور بہیمیت اور بربریت کی جن حدوں پر جا کھڑا ہوتا ہے، تقسیمِ ملک کے وقت ساحر کو اس کا بھی ذاتی تجربہ ہوا۔ ان کی شفیق والدہ تقسیم کے ہنگامۂ کشت و خون میں ان سے بچھڑیں اور وہ ان کی تلاش میں جان ہتھیلی پر لیے اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے۔ انھوں نے فرقہ وارانہ عصبیت کا خونی ناچ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کا انسانی اخوت کا وہ خواب چکنا چور ہو کر رہ گیا جس کی تعبیر کے جویا ہر دور کے نیک دل انسان رہے ہیں۔ مذہب سے بیگانگی بلکہ کسی حد تک بیزاری کا راستہ اشتراکی نظریے نے بھی انھیں دکھایا ہوگا لیکن ان کی شاعری سے ایک غیر مذہبی انسانی معاشرے کا جو تصور اُبھرتا ہے اس کی آبیاری اس خون نے بھی ضرور کی ہے جو انھوں نے مذہبی جنون کے نتیجے میں وطنِ عزیز کی سڑکوں پر اور گلیوں میں بہتے دیکھا تھا۔ اکثر ترقی پسند مصنفین نے ان خونیں واقعات کی ایسی توجیہیں اور تاویلیں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جن کے سہارے ان کی ذمہ داری کسی بیرونی طاقت کے سر ڈال دی جائے، بالخصوص ملک چھوڑ کر جانے والے بدیسی حکمرانوں پر لیکن ساحر بجا طور پر ان کا ذمہ دار ہموطنوں کے بیجا اشتعال اور ناعاقبت اندیشی کو ٹھہراتے ہیں۔ ان کی نظم "آج" فسادات کے المیے پر ایک ایسے شخص کا تاثر پیش کرتی ہے جو اپنے ساتھی انسانوں کو حیوانوں کے روپ میں دیکھ کر ستا بہ قدم کراہ بن کر رہ گیا ہے:

مثلاً،

ساتھیو! مَیں نے برسوں تمھارے لیے
چاند تاروں، بہاروں کے سپنے بُنے
حُسن اور عشق کے گیت گاتا رہا!
آرزوؤں کے ایواں سجاتا رہا
مَیں تمھارا مغنّی تمھارے لیے
جب بھی آیا نئے گیت لاتا رہا
آج لیکن مرے دامنِ چاک میں
گردِ راہِ سفر کے سوا کچھ نہیں
میرے بربط کے سینے میں نغموں کا دَم گھٹ گیا ہے

. . . .

اور مَیں —— اپنا ٹوٹا ہوا ساز تھامے
سرد لاشوں کے انبار کو تک رہا ہوں
میرے چاروں طرف موت کی وحشتیں ناچتی ہیں
اور انساں کی حیوانیت جاگ اُٹھی ہے
بربریت کے خونخوار عفریت
اپنے ناپاک جبڑوں کو کھولے
خون پی پی کے غرّا رہے ہیں
بچّے ماؤں کی گودوں میں سہمے ہوئے ہیں
عصمتیں سر برہنہ پریشان ہیں
ہر طرف شورِ آہ و بُکا ہے
اور میں اس تباہی کے طوفان میں
آگ اور خوں کے ہیجان میں
سرنگوں اور شکستہ مکانوں کے مَلبے سے پُر راستوں پر
اپنے نغموں کی جھولی پسارے
در بدر پھر رہا ہوں

امنِ عالم کو موضوع بنا کر بھی بہت سے ترقی پسند شاعروں نے نظمیں کہی ہیں لیکن ان میں سے اکثر نظمیں ایک ہنگامی تحریکی نقطۂ نظر کی حامل ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ بہت کم مدت میں یہ ذہنوں سے محو ہوگئیں۔ ساحر کی نظم 'پرچھائیاں' اس موضوع پر ایک ایسی نظم ہے جو طویل زندگی پائے گی۔ کیونکہ ساحر نے موضوع کو نظم میں رسمی طور پر نہیں برتا ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نظم اپنی تمام تر تاثر انگیزی کے ساتھ آہستہ آہستہ شاعر کے باطن سے اُبھری ہے اور اس کے زخم خوردہ دل اور تاراج شدہ زندگی کے حوالے سے جنگ کی ان ہولناکیوں کو سامنے لاتی ہے جو پوری بنی نوع انسان کو اپنا ہدف بنانے کی گھات میں ہیں۔ اختتام تک پہنچتے پہنچتے نظم پھر شاعر کے ذاتی المیے کی طرف مراجعت کرتی ہے اور قاری کے ذہن پر ایک بھرپور تاثر قایم کرتی ہے۔ سردار جعفری کے لفظوں میں۔

تیسری جنگ کے خطرے کے سامنے جو اٹمی ہتھیاروں سے لڑی جائے گی اسے (شاعر کو) نئی محبت کرنے والی روحیں ہی نہیں بلکہ اپنی تنہائیاں اور اپنے تصورات کی پرچھائیاں بھی غیر محفوظ معلوم ہوتی ہیں اور وہ پچھلی جنگ اور آنے والی جنگ کا تقابل اس طرح کرتا ہے:

گزشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گزشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

اس طرح نظم اس ذاتی تاثر کی سطح پر واپس آجاتی ہے جس سے شروع ہوئی تھی۔ نظم کا یہ خاتمہ

بے حد خوبصورت اور مؤثر ہے۔

ساحر کے سیاسی آدرشوں نے ان کا بہت دُور تک ساتھ دیا۔ غیر ملکی سامراجی حکمرانوں سے ملک کی نجات کا خواب اور عالمی سطح پر ایک انسانیت دوست، امن پسند اور مساوات پر مبنی غیر طبقاتی سماج کے قیام کا تصور ان کے دل میں ہمیشہ اُمنگیں جگاتا رہا لیکن آزادی کے بعد مُلکی سیاست نے دھیرے دھیرے جو غیر اخلاقی رُخ اختیار کیا، قومی رہنما خود اپنے عوام کا جس بے شرمی سے استحصال کرنے لگے، خود عام افراد نے قومی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دینے کی جو روش اپنائی اور پھر بین الاقوامی سیاست نے جو رنگ دکھایا ساحر کے پسندیدہ فلسفۂ حیات مارکسزم / لینن ازم کی جو باہم متضاد و متخالف تعبیریں سامنے آئیں اور ان کے خوابوں کی سرزمین سوویت روس میں اشتراکی انقلاب کے بعد رونما ہونے والے ناپسندیدہ واقعات و عوامل سے، اسٹالن کی موت کے بعد جس طرح یکے بعد دیگرے پردے اُٹھتے چلے گئے، اس کے نتیجے میں ان کی یہ اُمنگیں بھی آخر آخر مضمحل ہو گئی تھیں۔ وہ نظریہ جو زندگی بھر انھیں عزیز رہا تھا اپنا بھرم کھو رہا تھا اور جو افراد اور قومیں اس نظریے کی علمبردار تھیں، ان کی منافقت بھی ان پر عیاں ہو گئی تھی۔ ساحر جیسے حساس انسان اور شاعر کے لیے ازالۂ سحر کا یہ تجربہ کس قدر اذیت ناک رہا ہوگا اس کا اندازہ ان کی آخری دَور کی نظموں سے بخوبی ہو جاتا ہے جو اُن کے دوسرے مجموعۂ کلام "آؤ کہ کوئی خواب بُنیں" میں شامل ہیں۔ یہاں دو نظموں کے کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ پہلی نظم کا عنوان ہے:

۲۶ جنوری:

آؤ کہ آج غور کریں اس سوال پر
دیکھے تھے ہم نے جو وہ حسیں خواب کیا ہوئے
دولت بڑھی تو ملک میں افلاس کیوں بڑھا
خوش حالیِ عوام کے اسباب کیا ہوئے
بے کس برہنگی کو کفن تک نہیں نصیب
وہ وعدہ ہائے اطلس و کمخواب کیا ہوئے

جمہوریت نواز، بشر دوست، امن خواہ
خود کو جو خود دیے تھے وہ القاب کیا ہوئے
صحرائے تیرگی میں بھٹکتی ہے زندگی
اُبھرے تھے جو افق پہ وہ مہتاب کیا ہوئے
مجرم ہوں میں اگر تو گنہگار تم بھی ہو
اے رہروانِ قوم خطا کار تم بھی ہو

لینن نظم دو حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصّے کا ذیلی عنوان ہے "۱۹۱۷" اس میں ساحر نے لینن کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ہے:

اخلاق پریشاں تھا، تہذیب ہراساں تھی
بدکار حضوروں سے بدنسل جنابوں سے
عیّار سیاست نے ڈھانپا تھا جرائم کو
اربابِ کلیسا کی حکمت کے نقابوں سے
انساں کے مقدّر کو آزاد کیا تو نے
مذہب کے فریبوں سے، شاہی کے عذابوں سے

نظم کے دوسرے حصّے کا ذیلی عنوان ہے "۱۹۷۰" اس میں لینن کو خطاب کرتے ہوئے ساحر لینن ازم کے اس زوال کا ماتم کرتے نظر آتے ہیں جس سے وہ مشرق و مغرب میں دوچار ہے:

کیا جانیں، تری اُمّت کس حال کو پہنچے گی
بڑھتی چلی جاتی ہے تعداد اماموں کی
ہر گوشۂ مغرب میں ہر خطۂ مشرق میں
تشریح دگرگوں ہے اب تیرے پیاموں کی

وہ لوگ جنھیں کل تک دعویٰ تھا رفاقت کا
تذلیل پہ اُترے ہیں اپنوں ہی کے ناموں کی
طبقوں سے نکل کر ہم فرقوں میں بٹ جائیں
بن کر نہ بگڑ جائے تقدیر غلاموں کی

ساحر اوائلِ عمر ہی سے جن مجروح احساسات کے ساتھ زندگی گزارتے رہے انھوں نے ان کی شخصیت اور شاعری دونوں پر گہرے اثرات ڈالے ہیں ——

ساحر کی حیاتِ معاشقہ کے بارے میں متعدد روایتیں ہیں لیکن ان تمام روایتوں میں ایک بات مشترک ہے۔ وہ یہ کہ ان کے ہر معاشقے کا اختتام ناکامی پر ہوا۔ اس ناکامی کی وجہ کیا تھی؟ محبوبہ کا گریز؟ غالباً نہیں۔ امرتا پریتم نے جو شاید ان کی پہلی محبت تھیں، ساحر کے ساتھ اپنے تعلقِ خاطر کا جس والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے اور ان کے لیے جس جذباتی وارفتگی کا اظہار کیا ہے وہ اس قیاس کی تردید کے لیے کافی ہے۔ خود ساحر کی شاعری سے جس محبوبہ کی تصویر اُبھرتی ہے وہ بھی کسی بے وفا لڑکی کی تصویر نہیں۔ اس میں خود سپردگی کی ادا بھی ہے اور خوئے وفا بھی بالعموم اظہارِ محبت میں پہل بھی اسی کی طرف سے ہوئی ہے:

برف برسائی مرے ذہن و تصور نے مگر
دل میں اک شعلۂ بے نام سا لہرا ہی گیا
تیری چپ چاپ نگاہوں کو سُلگتے پاکر
میری بیزار طبیعت کو بھی پیار آ ہی گیا[1]

(نظم: اسی دوراہے پر)

ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ ساحر کی زندگی میں جو لڑکیاں آئیں، ساحر ان میں سے جسے چاہتے اپنا سکتے تھے مگر وہ ایسا نہ کر سکے۔ ساحر نے اپنی بیشتر

---

[1] نظم کا عنوان صاف اشارہ کر رہا ہے کہ شاعر اس تجربے سے پہلے بھی گزر چکا ہے۔

نظموں میں اپنی اس محرومی کا ذمہ دار اس سماجی ماحول کو قرار دیا ہے جہاں ہر چیز زر کی ترازو میں تلتی ہے۔ ساحر کا رقیب سرمایہ دار ہے اور وہ ان کی محبوبہ کو خرید لیتا ہے۔ ان کی حیاتِ معاشقہ سے متعلق لگ بھگ ہر نظم یہی کہانی دہراتی ہے۔ یہاں صرف ایک نظم کا حوالہ کافی ہے جس کا عنوان ہے "شہکار":

مصور! میں ترا شہکار واپس کرنے آیا ہوں

. . . .

تبسم آفریں چہرے میں کچھ سنجیدگی بھر دے
جواں سینے کی مخروطی اٹھانیں سرنگوں کر دے
گھنے بالوں کو کم کر دے مگر رخشندگی دے دے
نظر سے تمکنت لے کر مذاقِ عاجزی دے دے

مگر ہاں بنچ کے بدلے اسے صوفے پہ بٹھلا دے
یہاں میری بجائے اک چمکتی کار دکھلا دے

لیکن ساحر یہاں ایک نفسیاتی مغالطے کا شکار ہیں۔ اگر قصہ صرف اتنا ہی ہوتا تو ایک مقام وہ آیا تھا جہاں ساحر بھی بہ آسانی محبوبہ کو چمکتی کار پیش کر سکتے تھے۔ اس حیثیت کو پہنچنے کے بعد بھی ساحر کی زندگی میں کئی لڑکیاں آئیں مگر ان کی تنہائیوں کی ساتھی نہ بن سکیں۔ پھر ساحر کی اس محرومی کے اسباب کہاں تلاش کیے جائیں؟ میرا جواب یہ ہے کہ ساحر کے انہی تلخ تجربات میں جن سے ان کی زندگی عبارت تھی۔ اوپر ان کی نظم "اسی دوراہے پر" کا جو بند نقل ہوا ہے اس کا آخری مصرعہ ہے:

میری بیزار طبیعت کو بھی پیار آ ہی گیا

اس معمے کی کلید ان کی یہی بیزار طبیعت ہے جس نے انھیں زندگی بھر نہ کسی کا ہونے دیا نہ کسی کو اپنا بنانے دیا اور اس بیزاری کے پیچھے وہی مشاہدے اور

تجربے میں جوان کے پورے وجود میں کڑواہٹ اور ہراس بن کر سما گئے تھے۔ تائید مزید کے لیے ان کی نظم "معذوری" کے یہ چند شعر بھی پڑھ لیجیے:

. . . .

میں کہ مایوسی مری فطرت میں داخل ہو چکی
جبر بھی خود پر کروں تو گنگنا سکتا نہیں
مجھ میں کیا دیکھا کہ تم الفت کا دم بھرنے لگیں
میں تو خود اپنے بھی کوئی کام آ سکتا نہیں

. . . .

دل تمھاری شدتِ احساس سے واقف تو ہے
اپنے احساسات سے دامن چھڑا سکتا نہیں
تم مری ہو کر بھی بیگانہ ہی پاؤگی مجھے
میں تمھارا ہو کے بھی تم میں سما سکتا نہیں

ساحرؔ کی ایک غزل کا شعر بھی یاد آیا جو ان کی اس مخصوص مزاجی کیفیت کا آئینہ دار ہے:

ہر شے قریب آ کے کشش اپنی کھو گئی
وہ بھی علاجِ شوقِ گریزاں نہ کر سکے

ان کے اس "شوقِ گریزاں" نے انھیں کسی ایک موڑ پر ٹھہرنے نہ دیا اور وہ زندگی بھر کچھ پرچھائیوں کا تعاقب کرتے رہے۔

اگلے صفحات میں آپ مسعود منوّر اور ناز صدیقی کے مضامین پڑھیں گے۔ مسعود منوّر نے ساحر کے فکری میلانات اور ان کے شعری اظہارات کو اپنے تاثرات کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور ناز صدیقی صاحبہ نے ان کے اسلوب کا علمی تجزیہ پیش کیا ہے ——— میں اپنے اس خیال پر اصرار کرتا ہوں کہ اپنے ماضی سے گریزاں، حال سے ناآسودہ اور مستقبل سے ہراساں ایک شخص، سماجی ناانصافیوں اور نابرابریوں

کے خلاف مسلسل احتجاج کرتا ہوا، نام نہاد مہذب معاشرے میں مرد کی جبرہ دستیوں اور عورت کی پامالیوں پر کڑھتا ہوا، بھری پری دُنیا میں سب سے الگ تھلگ اپنی سلگتی ہوئی تنہائیوں کے صحرا میں سفر کرتا ہوا ایک کردار! جو ساحر کی پوری شاعری کا مرکز و محور ہے، یہ شخص کوئی اور نہیں خود ساحر ہیں اور یہ کردار کسی اور کا نہیں خود ساحر کا ہے۔ یہ شعر ایک بار پھر پڑھ لیجیے کہ اپنی شاعری کے بارے میں ساحر کا یہ دعویٰ لفظ بہ لفظ درست معلوم ہوتا ہے:

دُنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ساحرؔ نے اپنی زندگی میں حوصلہ شکن تلخ حقیقتوں کا سامنا کرتے ہوئے ہمیشہ ایک روشن مستقبل کے خواب دیکھے۔ اپنے لیے بھی اور پوری بنی نوع انسان کے لیے بھی مگر ایسا لگتا ہے کہ اب یہ خواب بھی ان کا ساتھ چھوڑ چلے تھے۔ ان کے دوسرے مجموعۂ کلام کا نام بھی "آؤ کہ کوئی خواب بُنیں" اس طرف ایک مرموز اشارہ ہے۔ ذاتی طور پر وہ عمر کی اس سرحد تک آ چلے تھے جہاں تجربے کی پختگی خوش آئند خواب دیکھنے کی کم ہی اجازت دیتی ہے اور گرد و پیش کا منظر بھی کچھ کم سنگین نہیں تھا۔

ساحر کی پوری جوانی جلتی سلگتی تنہائیوں کی نذر ہوئی آخر عمر میں تنہائی کے اس لق و دق صحرا میں جو اُن کی داخلی اور خارجی دونوں دُنیاؤں کا احاطہ کر چکا تھا، صرف اُن کی والدہ کی شفقت ہی ایک ایسا شجرِ سایہ دار تھا جس کے تلے وہ سکون کی سانس لے سکتے تھے ——— ۳۱ر جولائی ۱۹۷۶ء کو جب یہ شجرِ سایہ دار ٹوٹ کر گرا اور ان کی والدہ ہمیشہ کے لیے انھیں داغِ مفارقت دے گئیں تو زندگی سے ساحر کی رہی سہی دل چسپی بھی جیسے ختم ہو کر رہ گئی۔ کیسا دردناک شعر کہا ہے

انھوں نے :

کس لیے جیتے ہیں ہم کس کے لیے جیتے ہیں
بارہا ایسے سوالات پہ رونا آیا

والدہ کا انتقال ساحر کی زندگی کا آخری صدمہ تھا جس کے اثرات سے وہ مرتے دم تک بحال نہ ہو سکے۔

ساحر ہمارے درمیان نہیں رہے۔ ان کا جسمانی وجود موت کی اندھی گپھاؤں کی نذر ہو گیا لیکن جب تک سینوں میں معصوم جذبات دل بن کر دھڑکتے رہیں گے، زندگی کی تب و تاب سے لبریز ان کی شاعری ہمارا ساتھ دے گی۔ عمر کے ایک خاص حصّے کے لیے اور ذہنی رفعت کی ایک خاص حد تک ان کے فن پاروں میں جو بے پناہ کشش ہے اس نے انھیں قدرِ بقا بخش دی ہے۔ وہ اپنے عہد کے بڑے شاعر نہ سہی ایک ایسے شاعر ضرور ہیں جسے جلد بھلایا نہ جا سکے گا۔

نئی دہلی
۹ر فروری ۱۹۸۱ء

—— مخمور سعیدی

رُوبہ رُو

شخصیت پر مضامین

امرتا پریتم
گوپال متل
ابراہیم جلیس

امرتا پریتم

ساحر

کچھ لازوال یادیں

جس چہرے کی روشنی میں سب سے پہلے دل کی تہوں میں درد جاگتے دیکھا وہ اس مذہب کا تھا جس مذہب کے ماننے والوں کے لیے گھر میں برتن بھی الگ رکھے جاتے تھے۔

یہی وہ چہرہ تھا جس نے میرے اندر انسانیت کی وہ جوت جگائی کہ تقسیم ملک کے وقت، تقسیم کے ہاتھوں تباہی سے دوچار ہوکر بھی جب میں نے اس حادثے کے بارے میں قلم اٹھایا تو دونوں مذہبی گروہوں کی زیادتیاں بغیر کسی رعایت یا ریزرویشن کے قلمبند کرسکی۔ یہ چہرہ نہ دیکھا ہوتا تو میرے ناول "پنجر" کی تقدیر نہ جانے کیا ہوتی۔

بس اکیس برس کی تھی جب اپنے خوابوں میں بسا ہوا یہ چہرہ اس دھرتی پر دیکھا اور زبان پہ بے ساختہ کسی کا یہ شعر آگیا:

تمھاری جیسی شباہت کو ڈھونڈتا تھا دل
تمھاری شکل نہ دیکھی تھی جس زمانے میں

(کافی برس بعد اس پہلی ملاقات کی تفصیل میں نے "آخری خط" میں بیان کی تھی)

اس کے بعد ایک آگ کا دریا تھا جس سے میں دن رات گزرتی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۷ء

میں جب مجھے ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ ملا، تو فون پر یہ خبر ملتے ہی میں سر سے پاؤں تک تپنے لگی۔ یا خدایا یہ "سنہڑے" میں نے کسی انعام کے لیے تو نہیں لکھے تھے۔ اس نے تو انھیں پڑھا ہی نہیں اب ساری دنیا بھی پڑھے تو مجھے کیا۔

اس شام ایک پریس رپورٹر آیا، فوٹوگرافر ساتھ تھا۔ وہ میری تصویر لینا چاہتا تھا جس میں میں نظم لکھتی ہوئی نظر آؤں۔ میں نے سامنے میز پر کاغذ رکھا اور قلم ہاتھ میں لے کر کاغذ پر کوئی نظم لکھنے کی بجائے، کسی ارادے کے بغیر اس کا نام لکھنے لگی جس کے لیے میں نے سنہڑے لکھے تھے —— ساحر، ساحر، ساحر، ساحر ۔ ۔ ۔ سارا کاغذ بھر گیا۔

پریس کے لوگ چلے گئے تو اکیلے بیٹھے ہوئے مجھے خیال آیا: صبح اخباروں میں یہ تصویر چھپے گی تو میز پر پھیلے ہوئے کاغذ پر ساحر کے نام کی گردان نظر آئے گی ۔ ۔ ۔ اوہ خدایا!

مجنوں کے 'لیلیٰ لیلیٰ' پکارنے والی کیفیت کا تجربہ ہوا مجھے اس روز۔

لیکن کیمرے کا فوکس میرے ہاتھ پر تھا، کاغذ پر نہیں اس لیے دوسرے دن کے اخباروں میں کاغذ پر کچھ بھی نہیں پڑھا جا سکتا تھا (کچھ بھی نہیں پڑھا جا سکتا تھا، یہ تسلی ہونے کے بعد ایک کسک ایک چبھن بھی اس میں شامل ہو گئی۔ کاغذ خالی نظر آ رہا ہے۔ مگر خدا شاہد ہے کہ وہ خالی نہیں تھا)

ساحر کی میں نے تھوڑی سی اپنے ناول "اشرد" میں تصویر کشی کی ہے پھر ایک بھی انیتا میں اور پھر دلّی کی گلیاں میں ساگر کے روپ میں۔

نظمیں بہت سی لکھی ہیں، سنہڑے، سب سے لمبی نظم اور دوسری کئی نظمیں اور آخر میں نظم "آج کی بات" لکھ کر محسوس ہوا کہ اب چودہ برس کا بن باس پورا کرنے کی آزادی کی طرف لوٹ آئی ہوں۔

لیکن بیتے ہوئے ماہ و سال، بدن کے لباس کی طرح نہیں ہوتے۔ یہ داغوں کے نشان کی طرح ہوتے ہیں، کہتے کچھ نہیں لیکن جسم سے الگ نہیں ہوتے۔ کئی برس بعد —— بلغاریہ کے جنوب میں وارنا کے ایک ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی جہاں ایک طرف سمندر تھا، دوسری طرف جنگل اور تیسری جانب پہاڑ۔ وہاں ایک رات ایسا محسوس ہوا جیسے سمندر کی طرف سے ایک ناؤ آئی ہے اور اس میں سے اتر کر کوئی کھڑکی کی راہ سے میرے کمرے میں آ گیا ہے۔

خواب اور حقیقت ایک ہو گئے تھے۔ اس رات ایک نظم لکھی "تیری یادیں بہت

دنوں سے جلاوطن تھیں"۔

ساحر سے میری اور امروز (مصنفہ کے نئے آئیڈیل) کی ایک ساتھ ملاقات ہو چکی ہے۔ پہلی بار وہ اُداس تھا ——— ہم تینوں نے ایک ہی میز پر بیٹھ کر جو کچھ پیا تھا، اس کے خالی گلاس میرے اور امروز کے وہاں سے اُٹھ کر چلے آنے کے بعد بھی ساحر کی میز پر پڑے رہے۔ اس رات اس نے ایک نظم لکھی تھی:

میرے ساتھی خالی جام!
تم آباد گھروں کے باسی
ہیں آوارہ اور بدنام!

اور یہ نظم اس نے مجھے اُسی رات کوئی گیارہ بجے فون پر سُنائی اور بتایا کہ وہ باری باری تینوں گلاسوں میں وسکی ڈال کر پی رہا ہے لیکن بمبئی میں جب دوبارہ ہماری ملاقات ہوئی تو اس وقت امروز کو بخار چڑھا ہوا تھا، اس نے فوراً اپنے ڈاکٹر کو فون کیا اور امروز کو دوا دلوائی۔

یوں تو میرے اندر کی عورت ہمیشہ میرے اندر کی فن کار سے پیچھے رہی ہے، دوسرے نمبر پر۔ یہاں تک کہ کئی بار اپنے اندر کی عورت کا میں نے خود اپنے کو دھیان دلایا ہے۔ صرف فن کارہ کا رُوپ ہمیشہ اتنا روشن رہا کہ میری اپنی آنکھوں کو بھی میری پہچان اسی میں ملتی ہے۔

لیکن زندگی میں تین وقت ایسے آئے ہیں جب میں نے اپنے اندر کی "صرف عورت" کو جی بھر کر دیکھا ہے۔ اس کا روپ اتنا ابھرا ہوا تھا کہ میرے اندر کی "فن کارہ" کا وجود میرے لیے محو ہو گیا۔ وہاں کوئی خلا نہیں تھا جو اس کی یاد دلاتا۔ یہ یاد صرف اب کر سکتی ہوں ——— کئی برس کی دُوری پر کھڑی ہو کر۔

پہلی بار اپنے اندر کی عورت کو میں نے اس وقت دیکھا تھا جب میری عمر پچیس برس کی ہو گئی تھی اور میری گود بچے سے خالی تھی۔ تقریباً ہر رات مجھے ایک بچے کا خواب آتا، ایک ننھا منا چہرہ، ترشے ہوئے نین نقش، ٹکر ٹکر میری طرف دیکھتا ہوا۔ اور بار بار یہی خواب

دیکھتے دیکھتے مجھے اس بچے کے چہرے کی پکی پہچان ہو گئی ۔ خواب میں وہ مجھ سے باتیں بھی کرتا تھا ، روزانہ ایک سی باتیں ۔ میں اس کی آواز بھی پہچاننے لگی تھی ۔ خواب میں میں پودوں کو پانی دے رہی ہوتی تھی اور اچانک ایک گملے میں پھول کی جگہ ایک بچے کا چہرہ کھِل اُٹھتا تھا ۔

میں چونک کر پوچھتی تھی : " تو کہاں تھا ؟ میں تجھے ڈھونڈتی رہی . . . "

اور وہ معصوم چہرہ ہنس پڑتا تھا " میں یہاں چھپا ہوا تھا ۔ "

اور میں جلدی سے گملے میں سے بچے کو اُٹھا لیتی تھی ۔ لیکن جاگنے پر میں ویسی کی ویسی ہی ہوتی ——— سونی ، ویران اور اکیلی ——— " صرف ایک عورت " جو اگر ماں نہیں بن سکتی تھی تو جینا بھی نہیں چاہتی تھی ۔

دوسری بار یہ مشاہدہ میں نے تب کیا جب ایک دن ساحر آیا تھا اور اسے ہلکا سا بخار تھا ۔ اس کے گلے میں درد بھی تھا اور سانس میں کھنچاؤ کی سی کیفیت تھی ۔ اس دن اس کے گلے اور چھاتی پر میں نے وکس ملی تھی ، کتنی ہی دیر ملتی رہی تھی اور تب محسوس ہوا تھا ، اسی طرح پیروں پر کھڑے کھڑے ، پوروں سے ، انگلیوں سے اور ہتھیلیوں سے اس کی چھاتی کو ہولے ہولے ملتے ہوئے میں اپنی پوری عمر گزار سکتی ہوں ۔ میرے اندر کی عورت کو اس وقت دُنیا کے کسی کاغذ قلم کی ضرورت نہیں تھی ۔

اور تیسری بار " یہ صرف عورت " میں نے تب دیکھی تھی جب اپنے اسٹوڈیو میں بیٹھے ہوئے امروز نے اپنا پتلا سا برش اپنے کینوس کے اوپر سے اُٹھا کر اسے ایک بار لال رنگ میں ڈبویا تھا اور پھر اس برش سے میرے ماتھے پر بندی لگا دی تھی ۔

تقسیمِ ملک سے پہلے میرے پاس ایک چیز تھی جسے میں سنبھال سنبھال کر رکھتی تھی ۔ یہ ساحر کی نظم " تاج محل " تھی جو اس نے فریم کرا کے مجھے دی تھی ۔ آج تقسیم کی بربادی کے برسوں بعد اپنی الماری کا اندرونی خانہ ٹٹولنے لگی تو کسی دبے ہوئے خزانے کی طرح کچھ ظاہر ہو رہا ہے . . .

ایک پتہ ہے جو میں ٹالسٹائی کی قبر پر سے اُٹھا لائی تھی اور ایک کاغذ کا گول ٹکڑا ہے جس کے ایک طرف چھپا ہوا ہے " ایشین رائٹرز کانفرنس " اور دوسری طرف ہاتھ سے لکھا

ہوا ہے "ساحر لدھیانوی" یہ وہ بیج ہے جو کانفرنس کے موقع پر تمام مندوبین کو دیا گیا تھا۔ میں نے اپنے نام کا بیج اپنے کوٹ پر لگایا ہوا تھا اور ساحر نے اپنے نام کا اپنے کوٹ پر۔ ساحر نے اپنا بیج اُتار کر میرے کوٹ پر لگا دیا اور میرا بیج اُتار کر اپنے کوٹ پر لگا لیا۔ اور آج کاغذ کا یہ ٹکڑا، ٹالسٹائی کی قبر سے اُٹھائے ہوئے پتّے کے پاس پڑا ہوا مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ بھی میں نے ایک پتّے کی طرح اپنے ہاتھ سے خود اپنی قبر پر سے اُٹھایا ہے۔

پاس ہی ویت نام کی بنی ہوئی ایک ایش ٹرے ہے جو آذربائی جان کی راجدھانی باکو میں وہاں کی شاعرہ میخاروخانم نے مجھے دی تھی یہ کہتے ہوئے کہ "جب جب تمھارے الہام کا دھواں تمھارے سگریٹ کے دھوئیں سے مِل جائے مجھے یاد کر لینا۔"

برسوں اس دھوئیں میں چہرے اُبھرتے مٹتے رہے ہیں . . . صرف اوروں کے ہی نہیں اپنا چہرہ بھی۔ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنا چہرہ بھی —— پگھلتا اور کانپتا ہوا۔ حقیقت میں تبھی دیکھا ہے جب کوئی نظم لکھی ہے۔

"عمراں دے اس کاگذ اُتّے عشق ترے انگوٹھا لایا، کون حساب چکائے گا" اس نظم کی شانِ نزول یہ تھی کہ ایک بار ایک اُردو مشاعرے کے موقع پر لوگ ساحر سے آٹوگراف لے رہے تھے۔ لوگ کچھ اِدھر اُدھر ہوئے تو میں نے ہنس کر ہتھیلی اس کے آگے کر دی اور کہا: "آٹوگراف!" ساحر نے ہاتھ میں لیے ہوئے قلم کی سیاہی اپنے انگوٹھے پر لگا کر انگوٹھا میری ہتھیلی پر رکھ دیا، جیسے میری ہتھیلی کے پنّے پر اپنے دستخط ثبت کر دیے ہوں میری ہتھیلی جس پر اس نے دستخط کیے اس پر کیا لکھا ہوا تھا یہ سب ہواؤں کے حوالے ہے۔ اسے نہ خود اس نے کبھی پڑھا نہ زندگی نے اس لیے میں کہہ سکتی ہوں۔

ساحر ایک خیال تھا —— ہوا میں چمکتا ہوا، شاید میرے اپنے ہی خیالوں کا ایک ساحرانہ عکس لیکن امروز کے ساتھ بتائی ہوئی زندگی، شروع کے کچھ برسوں کو چھوڑ کر ایک بے خودی کے عالم تک پہنچ گئی ہے۔

اور امروز جانتا ہے میں نے ساحر سے محبت کی تھی لیکن یہ جانکاری اپنی جگہ کوئی بڑی بات نہیں ہے، اس سے آگے جا کر امروز کی بڑائی یہ ہے کہ اس محبت میں میری ناکامی کو امروز اپنی ناکامی سمجھتا ہے۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میرا بیٹا میرے جسم کی آس بنا تھا۔ ۱۹۴۶ء کے

آخری دنوں کی بات ہے . . .

اخباروں اور کتابوں میں کئی بار پڑھا تھا کہ ہونے والی ماں کے کمرے میں جس طرح کی تصویریں بھی ہوں یا اُس کے خیالوں میں جو چہرہ بسا رہے، بچّے کی صورت اسی پر جاتی ہے اور میرے دل نے جیسے دُنیا سے چھُپ کر سرگوشی میں مجھ سے کہا —— اگر میں ساحر کے چہرے کو ہر لمحہ اپنے خیالوں میں رکھوں تو میرے بچّے کی شکل میں اس کی شباہت آ جائے گی جسے میں زندگی میں نہیں پا سکی تھی، اسے خوابوں میں پا لینے کی ایک کرشمہ ساز کوشش۔

خدا کی طرح صورت آفرینی کی خلاقانہ کوشش۔

جسم کا ایک آزادانہ عمل

صرف روایت ہی سے آزادی نہیں، خون اور نسل کی گرفت سے بھی رہائی۔

دیوانگی کے اس عالم میں جب ۳ر جولائی ۱۹۴۷ء کو بچّے کا جنم ہوا اور پہلی بار اس کی شکل دیکھی تو اپنی خلّاقی پر یقین آگیا اور بچّے کے واضح ہوتے ہوئے خد و خال کے ساتھ اپنا تصور واقعی متشکّل ہوتا نظر پڑا۔ میرے بیٹے کی صورت سچ مچ ساحر سے ملتی ہے . . .

خیر دیوانگی کی آخری چوٹی پر پاؤں رکھ کر ہمیشہ کھڑا نہیں رہا جا سکتا۔ پاؤں ٹکانے کے لیے زمین کا کوئی ٹکڑا چاہیے۔ اس لیے آئندہ برسوں میں اس واقعے کا ذکر میں اس طرح کرنے لگی جیسے یہ پریوں کے دیس کی کوئی کہانی ہو۔

ایک بار میں نے یہ بات ساحر سے بھی کہی، اپنے آپ پر ہنستے ہوئے، اس پر کیا ردِّ عمل ہوا مجھے علم نہیں۔ میں نے تو بس اتنا دیکھا کہ ساحر ہنسنے لگا اور بولا:

"ویری پوور ٹیسٹ"

ساحر کی زندگی کا ایک بڑا المیہ، بلکہ میں یہ کہوں گی سب سے بڑا کمپلیکس یہ ہے کہ وہ اپنی نظر میں خوبصورت نہیں ہے اسی لیے اس نے یہ بات کہی۔

ایک اور واقعہ یاد آیا۔ ایک دن اس نے میری لڑکی کو اپنی گود میں بٹھا کر کہا تھا۔ "تمھیں ایک کہانی سناؤں" اور جب میری لڑکی کہانی سننے کے لیے تیار ہوئی تو ساحر کہنے لگا —— ایک لکڑہارا تھا وہ دن رات جنگل میں لکڑیاں کاٹا کرتا تھا۔ پھر ایک دن اس نے جنگل میں ایک راجکماری کو دیکھا، بہت خوبصورت۔ لکڑہارے کا جی چاہا

کہ وہ راجکماری کو لے کر بھاگ جائے۔۔۔"

"پھر؟" میری لڑکی کی عمر ابھی کہانیوں پر ہنکارے بھرنے کی تھی اس لیے وہ بڑے دھیان سے کہانی سُن رہی تھی۔

میں پاس بیٹھی صرف ہنس رہی تھی۔ کہانی میں دخل نہیں دے رہی تھی۔

ساحر کہہ رہا تھا "مگر وہ تھا تو ایک لکڑہارا۔ وہ راجکماری کو صرف دیکھتا رہا۔ دُور ہی سے کھڑے کھڑے اور پھر لکڑیاں کاٹنے لگا۔ سچی کہانی ہے نا!"

"ہاں میں نے بھی دیکھا تھا" بچی نے نہ جانے یہ کیوں کہا۔

ساحر ہنستے ہوئے میری طرف دیکھنے لگا۔ "دیکھو یہ بھی جانتی ہے" اور بچی سے اس نے پوچھا "تم وہاں تھیں جنگل میں؟"

بچی نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

ساحر نے ہنستے ہوئے پھر گود میں بیٹھی ہوئی بچی سے پوچھا "تم نے اس لکڑہارے کو بھی دیکھا تھا نا؟ وہ کون تھا؟"

بچی کو شاید اس وقت الہام ہو رہا تھا۔ بولی "آپ"

ساحر نے پھر پوچھا "اور وہ راجکماری کون تھی؟"

"ماما" بچی ہنسنے لگی۔

ساحر مجھ سے کہنے لگا۔ "دیکھا! بچے سب کچھ جانتے ہیں۔"

پھر کئی برس گزر گئے۔ ۱۹۶۰ء میں جب میں بمبئی گئی تو اُن دنوں راجندر سنگھ بیدی بڑے مہربان دوست تھے۔ اکثر ملتے تھے۔ ایک شام بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک انھوں نے پوچھا "پرکاش پنڈت کی زبانی ایک بار سُنا تھا کہ نوراج (مصنفہ کا بیٹا) ساحر کا بیٹا ہے۔۔۔؟"

اس شام میں نے بیدی صاحب کو اپنی دیوانگی کا وہ قصہ سُنایا اور کہا "یہ تصوراتی سچائی ہے واقعاتی نہیں۔"

اُنہی دنوں ایک دن نوراج نے بھی پوچھا، اس کی عمر اس وقت کوئی تیرہ برس کی تھی۔ "ماما! ایک بات پوچھوں، سچ سچ بتاؤ گی؟"

"پوچھو۔"

"کیا میں ساحر انکل کا بیٹا ہوں؟"

"نہیں۔"

"لیکن اگر ہوں تو بتا دو۔ مجھے ساحر انکل اچھے لگتے ہیں۔"

"ہاں بیٹا! مجھے بھی وہ اچھے لگتے ہیں لیکن اگر ایسا ہوتا تو میں نے تمھیں ضرور بتا دیا ہوتا!"

سچائی کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے لہٰذا میرے بچے کو میری بات پر یقین آ گیا۔

سوچتی ہوں ——— خیال کا سچ جھوٹا نہیں تھا لیکن وہ صرف میرے لیے تھا آشنا ذاتی کہ ساحر بھی اس میں شریک نہیں۔

لاہور میں جب کبھی ساحر ملنے کے لیے آتا تھا تو میری ہی خاموشی میں سے نکلا ہوا خاموشی کا ایک ٹکڑا کرسی پر بیٹھتا تھا اور چلا جاتا تھا۔

وہ چپ چاپ سگریٹ پیتا رہتا تھا، لگ بھگ آدھا سگریٹ پی کر راکھ دان میں بجھا دیتا تھا پھر نیا سگریٹ سلگا لیتا تھا اور اس کے جانے کے بعد صرف سگریٹوں کے بڑے بڑے ٹکڑے کمرے میں رہ جاتے تھے۔ کبھی کبھی . . . بس ایک بار اس کے ہاتھ کو چھونا چاہتی تھی لیکن میرے سامنے رواجوں کی ایک دوری تھی جو طے نہیں ہو پاتی تھی۔

تب بھی تصور کی کرامات کا سہارا لیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد اس کے چھوڑے ہوئے سگریٹوں کے ٹکڑوں کو سنبھال کر الماری میں رکھ لیتی اور پھر ایک ایک ٹکڑے کو اکیلی بیٹھ کر جلاتی تھی اور جب انگلیوں میں اسے پکڑتی تھی تو محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا ہاتھ چھو رہی ہوں۔

سگریٹ پینے کی عادت مجھے تبھی پہلی بار پڑی تھی۔ ہر سگریٹ کو سلگاتے ہوئے لگتا تھا کہ وہ پاس ہے۔ سگریٹ کے دھوئیں میں وہ جیسے جن کی طرح نمودار ہو جاتا تھا . . .

پھر برسوں بعد اپنے اس تجربے کو میں نے اپنے ناول "ایک تھی انیتا" میں کاغذ پر اُتارا۔ لیکن ساحر شاید ابھی تک میری سگریٹ نوشی کی اس تاریخ سے ناواقف ہے۔

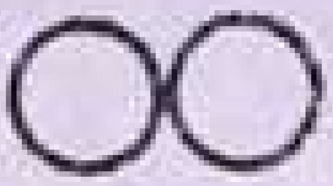
سوچتی ہوں ——— خیال کی یہ دُنیا صرف اس کی ہوتی ہے جو اس کی تخلیق کرتا ہے

خدا جیسا خلاق بھی اکیلا ہی ہے۔

آخر جس مٹی سے یہ جسم بنا ہے اس مٹی کی تاریخ میرے لہو کی گرمی میں شامل ہے۔ تخلیق کے آغاز میں جو آگ کا ایک گولا سا ہزاروں برس پانی میں تیرتا رہا تھا اس میں سے ہر گناہ کو بھسم کر کے جو جاندار باہر نکلا وہ اکیلا تھا۔ اسے نہ اکیلے پن کا خوف تھا نہ اکیلے پن کی خوشی پھر اس نے اپنے ہی بدن کو چیر کر آدھے کو مرد بنا دیا آدھے کو عورت اور اسی سے اس نے دُنیا کی تخلیق کی۔

دُنیا کا یہ تصور محض دیومالا نہیں ہے، نہ صرف زمانۂ قدیم کی تاریخ ہے۔ یہ ہر دَور کی تاریخ ہے، خواہ چھوٹے چھوٹے انسانوں کی چھوٹی چھوٹی سی تاریخ ہی سہی . . .

میری بھی . . .



گوپال مِتّل

ساحِر
اور
لاہور کے شب و روز

لاہور کی بساطِ شعر و ادب کے نو واردوں میں ساحر لدھیانوی بھی تھے۔ میری ان کی ملاقات روزنامہ "نیشنل کانگرس" کی ملازمت کے دوران اتفاقاً ہی ہو گئی۔ لاہور سے مالیر کوٹلہ جاتے ہوئے میں کچھ دیر کے لیے لدھیانہ ٹھہر گیا تھا۔ اس مختصر سے قیام کے دوران میں میں عرش ملسیانی سے ملنے گیا۔ شام کو کوئی مشاعرہ تھا۔ ان کے ساتھ ہی وہاں بھی چلا گیا ساحر سے میری ملاقات وہیں ہوئی۔ ساحر مجھے اپنے گھر لے گئے اور بڑی تواضع سے پیش آئے ساحر کا گھر آزاد منش نوجوان کا اچھا خاصہ کیمپ تھا۔ ان میں کوئی آرٹسٹ تھا، کوئی ریڈیو نیشٹ اور کوئی شاعر یا صرف شاعری کا پرستار۔ ساحر کے گھر ان سب کی تواضع ہوتی تھی اور تقریباً ہر وقت جمگھٹا سا لگا رہتا تھا، مجھے یہ ماحول پسند آیا چنانچہ جب یہ اصرار ہوا کہ میں اس رات کی بجائے اگلے دن مالیر کوٹلہ جاؤں تو میں نے فوراً ہی مان لیا۔

ساحر گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں طالب علم تھے جہاں مخلوط تعلیم تھی۔ کالج کا پرنسپل ایک انگریز تھا جو ہندوستان میں نیا نیا آیا تھا اس لیے یہاں کے ماحول سے کچھ زیادہ واقف نہیں تھا۔ چاہتا تھا کہ مخلوط تعلیم صحیح معنوں میں مخلوط ہو۔ لڑکے اور لڑکیاں صرف ہم درس ہی نہ ہوں بلکہ آزادانہ آپس میں ملیں جلیں بھی۔ یہ فیصلہ کافی پیچیدگیوں کا باعث

بنا۔ اکثر طالب علم قدامت زدہ گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ظاہر ہے اس قسم کا ماحول انھیں راس نہیں آسکتا تھا۔ ایک لڑکا جو قرآن کا حافظ تھا، لڑکیوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے اوراد و وظائف میں مصروف ہوگیا۔ اور ایک جو کچھ صوفی منش تھا دریا کے کنارے ایک ٹانگ پر کھڑا ہوکر عملِ حُب کرنے لگا۔

آخر کالج کے حکام نے فیصلہ کیا کہ حقیقی مخلوط تعلیم کا تجربہ کامیاب نہیں ہوا ہے اور طلبا کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا۔ جو لوگ میل جول کے کچھ زیادہ قائل تھے انھیں بالواسطہ طور پر مشورہ دیا گیا کہ وہ اس کالج کو چھوڑ کر کسی اور کالج کا رُخ کریں۔ اس سلسلے میں ساحر لدھیانوی بھی لدھیانہ کو خیرباد کہہ کر لاہور کے دیال سنگھ کالج میں پہنچ گئے۔

لدھیانے کے کمیونسٹوں کو جن کے لیے ساحر کافی مفید تھے یہ تشویش ہوئی کہ کہیں وہاں متبل کی بُری صحبت میں پڑ کر ساحر کا ترقی پسندی پر سے ایمان اُٹھ جائے گا۔ انھوں نے لاہوری کمیونسٹوں سے استمداد کی جنھوں نے ساحر کے ایمان کو راسخ بنانے کے لیے انھیں لاہور اسٹوڈنٹس یونین کا صدر بنا دیا۔ لیکن ساحر کی دل چسپیاں تعلیم اور سیاست دونوں سے بس واجبی ہی تھیں۔ نہ ان کی تعلیم کا سلسلہ زیادہ دن چلا اور نہ لیڈری کا۔ اور میرے ساتھ ان کے مراسم بدستور قائم رہے۔

تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوا تو ساحر شعر و ادب کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے۔ وہ مرنجان مرنج اور خوش اطوار تھے اور مادی طور پر صرف یہی نہیں کہ ضرورت مند نہیں تھے بلکہ دوسروں پر تھوڑا بہت خرچ بھی کر سکتے تھے۔ اس لیے انھیں شعر و ادب کی محفلوں میں جلد ہی پذیرائی حاصل ہوگئی۔ ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے لیے وہ ایثار بھی کافی کرتے تھے۔ خود بیہ اخبار اسٹریٹ کے گھٹیا چائے خانوں میں چائے پیتے اور دوسروں کی مال روڈ کے ریستورانوں میں تواضع کرتے۔ "ادب لطیف" کے ایڈیٹروں کو تنخواہ برائے نام ہی ملا کرتی تھی اور ایک طرح سے یہ عہدہ اعزازی ہی تھا لیکن حصولِ شہرت کا "ادب لطیف" چونکہ ایک اچھا ذریعہ تھا اس لیے ایڈیٹر ڈھونڈنے میں مالکوں کو کوئی خاص مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ ساحر لدھیانوی کچھ نمایاں ہوئے تو یہ عہدہ انھیں سونپ دیا گیا۔

ساحر لدھیانوی کو جو تنخواہ ملتی تھی اس سے کہیں زیادہ وہ جریدے کے مالک چودھری نذیر احمد کی تواضع پر صرف کر دیا کرتے تھے اس بنا پر انھیں ادارتی معاملات میں کافی چھوٹ ملی

ہوئی تھی۔ وہ جریدے کو اپنے ذاتی پروپیگنڈے کے لیے استعمال کرتے اور دوسرے شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ مراسم استوار کرنے کے لیے بھی۔

پروپیگنڈے کا فن بھی ساحر کو خوب آتا تھا وہ جانتے تھے کہ حصولِ شہرت کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ اپنے متعلق زیادہ سے زیادہ غلط فہمیاں پھیلائی جائیں۔ 'تلخیاں' کا پہلا ایڈیشن انھوں نے ڈھائی سو کی تعداد میں چھاپ کر دوستوں میں تقسیم کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد دُوسرا ایڈیشن چھاپنا چنداں مشکل نہیں تھا اور پہلے ایڈیشن کے اتنی جلد ختم ہو جانے کو بڑی آسانی سے کتاب کی بے پناہ مقبولیت کا نام دیا جا سکتا تھا۔

مجاہد بننے کا اُن دنوں سبھی ادیبوں اور شاعروں کو جنون تھا۔ ساحر بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں تھے لیکن یہ بھی ان کی نظر میں تھا کہ:

عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد

رندِ بلاکش وہ نہیں تھے اس لیے بہت ہی پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے۔ ان کی نظم 'چکلے' جو کسی فلم میں آکر کافی مشہور ہوگئی ہے وہ انھوں نے اُسی زمانے میں لکھی تھی۔ اس نظم کا ایک مصرعہ تھا:

خدیجہ کی ہم جنس رادھا کی بیٹی

کسی نے اُن سے کہا کہ طوائف کو خدیجہ کی ہم جنس کہنے کی بنا پر مسلمان اُن سے خفا ہو جائیں گے اور انھیں پیٹیں گے۔ ساحر نے فوراً ہی یہ مصرعہ اس طرح بدل دیا:

زلیخا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی

جب کچھ دوستوں نے یہ کہا کہ طوائف کو رادھا کی بیٹی کہنے پر ہندو بھی برہم ہو سکتے ہیں تو ساحر نے کہا کہ ہندو پیٹیں گے نہیں۔

شاعری میں ترکِ عشق کے دعاوی کے باوجود اپنی عام زندگی میں ترقی پسند شاعروں کا یہ رویّہ غزل کے روائتی عاشق سے چنداں مختلف نہیں تھا، یہ ہر خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر آہیں بھرنے اور طبقاتی تضاد کی دُہائی دیتے رہنے کے باوجود اونچی سے اونچی حویلی پر اپنے عشق کی کمند پھینکنے پر تیار رہتے۔ اس قسم کے ایک عشق کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ عشق ساحر لدھیانوی، دیویندر ستیارتھی اور ایک نوجوان شاعر اشک نے جس کا پچھلے دنوں بمبئی میں انتقال ہوگیا، امداد باہمی کے اصول پر کیا تھا اور ان کے عشق کی ہدف تھی ایک فارغ البال

شاعرہ!

ستیارتھی کے پاس اُن دنوں ایک کیمرہ تھا۔ ہر روز شاعرہ کی نئے نئے زاویوں سے تصویریں کھنچنے لگیں۔ ساحر کے پاس کیمرہ نہیں تھا لیکن انھوں نے اپنی پذیرائی کے لیے یہ حربہ ڈھونڈا کہ شاعرہ کے آنریری پبلسٹی ایجنٹ بن گئے۔ وہ اس کی نظموں کے اُردو میں منظوم ترجمے کرتے اور مختلف جرائد میں انھیں چھپواتے ہی نہیں تھے بلکہ اُن پر تعریفی نوٹ بھی لکھواتے۔

شاعرہ کا دوپہر کا وقت نسبتاً فراغت کا تھا۔ یہ دوپہر کی دھوپ میں پیدل اس کی کوٹھی پر پہنچتے اور وہ یہ سمجھ کر کہ غریب دھوپ میں چل کر آئے ہیں انھیں شربت پلا دیتی۔ یہ اس بے چاری کے ذہن میں کہاں تھا کہ یہ اس شربت کو شربتِ وصل کا دیباچہ سمجھتے ہیں۔

اس شاعرہ سے نہ تو میں کبھی ملا ہوں اور نہ میں نے اُسے دیکھا ہی ہے لیکن یہ تینوں حضرات چونکہ مجھے اپنا ایک ہمدرد رازداں سمجھتے تھے اور انھیں میرے حُسنِ سماعت پر بھروسہ تھا اس لیے ہر روز کی روداد مجھے سُناتے رہتے تھے۔ یہ جاننے کی کوشش میں نے کبھی نہیں کی کہ ان کی داستانوں میں حقیقت اور افسانے کا امتزاج کس تناسب سے ہے اور یہ کمال بھی مجھے حاصل ہے کہ میرے چہرے کی کیفیات سے کوئی داستان گو یہ اندازہ مشکل سے ہی لگا سکتا ہے کہ میں اس کی بات کو کس حد تک باور کر رہا ہوں۔

اس داستاں میں لطف بھی کافی بلا کا تھا

بالخصوص جب یہ ساحر یا اشک کی زبان سے بیان ہوتی تھی۔ یہ دونوں ستیارتھی سے کہیں زیادہ جانباز تھے اور ستیارتھی کی معیت میں دوپہر کے وقت شاعرہ کی کوٹھی پر جانے کے علاوہ رات بھر کوٹھی کا طواف بھی کیا کرتے تھے۔

اتفاق سے اُن دنوں میرے بیوی بچّے لاہور میں نہیں تھے، اور میں ایک ایسے ہفت روزہ اخبار میں کام کرتا تھا جہاں میرے کوئی معینہ اوقاتِ کار نہیں تھے۔ صرف اتنی ذمہ داری مجھ پر تھی کہ پرچہ وقت پر مرتب ہو جائے۔ لہٰذا فراغت ہی فراغت تھی۔ صبح کہیں ہوتی اور شام کہیں۔ اور لمحاتِ فرصت کو دلچسپ بنانے کا اس سے زیادہ اچھا طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ کسی کی داستانِ عشق سُنی جائے۔

اشکؔ اُن دنوں کالج میں پڑھتے تھے اور ساحرؔ کا بیشتر وقت بھی بالعموم وہیں گزرتا تھا۔ جب کافی شام ہو چکتی، ساحرؔ اور اشکؔ کہیں چل دیتے اور اگلی صبح ہی آتے۔ میں اس دوران میں اشکؔ کے کمرے میں سوتا رہتا۔ صبح آکر وہ مجھے جگاتے اور نہانے دھونے اور ناشتے سے فارغ ہوتے ہی اپنی داستانِ عشق شروع کر دیتے۔ عجیب بات یہ تھی کہ الگ الگ دونوں ہی مجھے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ وہ عشق کا سوانگ رچا کر دوسرے کو بنا رہے ہیں۔ اگر یہ واقعی بنانا تھا تو رات بھر کی بیداری اس کی کچھ زیادہ ہی قیمت تھی۔ کبھی کبھی مجھے یہ بھی شبہ گزرتا تھا کہ ساحرؔ اس مقولے پر عمل کر رہا ہے کہ حصولِ شہرت کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ اپنے متعلق جتنی غلط فہمیاں پھیلا سکتے ہو پھیلا دو۔

ایک دن آسمان پھٹ پڑا۔ اس وقت تک ساحرؔ بیسہ اخبار اسٹریٹ میں شورشؔ کاشمیری کے کمرے میں منتقل ہو چکے تھے۔ شورشؔ اکثر خود وہاں موجود نہیں رہتے تھے اس لیے محفل وہیں جم جاتی تھی۔ اس دن میں وہاں پہنچا تو سناٹا تھا، ساحرؔ اور اشکؔ شاعرہ پر بُری طرح برس رہے تھے جس نے دولت کا سہارا لے کر ان غریبوں کی محبت کا مذاق اُڑایا تھا۔ خیریت پوچھی تو پتہ چلا کہ آج جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو شاعرہ نے یہ کہہ کر تصویریں کھینچنے میں آپ حضرات کی جو فلمیں صرف ہوئی ہیں، ان کی قیمت تو مجھ سے لے ہی لیجیے۔ انھیں حق الخدمت پیش کر دیا تھا۔

ایک بار میں لدھیانہ گیا ہوا تھا اور ساحرؔ کا مہمان تھا۔ وہاں کی کندن وڈ فیکٹری کے مالکوں کا ایک لڑکا شعر و ادب میں دل چسپی رکھتا تھا۔ اُس نے مجھے اور ساحرؔ کو لنچ پر مدعو کیا۔ لنچ پُر تکلف تھا اور میزبان بڑے ہی احترام سے پیش آرہا تھا لیکن گفتگو کا رُخ یکا یک شعر و ادب کی بجائے سیاست کی طرف مُڑ گیا۔ اُسے پتہ چلا کہ میں ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی سے وابستہ ہوں تو فوراً ہی اندر کمرے میں گیا اور کمیونسٹ پارٹی کے آئین کا کتابچہ اُٹھا لایا اور میری توجہ آئین کی اس دفعہ کی طرف دلائی جس میں پارٹی کے ممبروں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ فاشسٹوں کے ساتھ سماجی مراسم بھی نہ رکھیں۔ جن فاشسٹ گروپوں کا نام آئین میں صراحتاً درج تھا ان میں ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی بھی شامل تھی۔ میں ایک لفظ کہے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا اور لنچ بیچ میں ہی رہ گیا۔

کمیونسٹوں کی ذہنی انتہا اور ان کے طور طریقوں کے بارے میں ساحرؔ کی دوستی

کے طفیل مجھے کئی بار اہم اور دلچسپ باتیں معلوم ہوئیں۔ میکلوڈ روڈ کی وہ کوٹھی جس میں پابندی اُٹھ جانے کے بعد پنجاب کمیونسٹ پارٹی کا دفتر قائم ہوا پہلے کچھ طالب علموں نے مل کر لے رکھی تھی۔ ان میں ساحر بھی شامل تھے۔ میرا خیال ہے کہ ساحر کو چھوڑ کر جو اپنے حصے کے اخراجات خود ادا کرتے تھے۔ باقی طالب علم کمیونسٹوں کے خرچ پر ہی پل رہے تھے۔ بہرحال واقعہ یہ ہے کہ یہ کمیونسٹوں کا اچھا خاصہ اڈہ تھا۔ ساحر کی وجہ سے میرا وہاں کافی آنا جانا تھا، اور کئی بار تو رات بھی وہیں بسر ہو جاتی تھی۔ ساحر کو اپنے دوستوں کے طور طریقے پسند نہیں تھے اور ان کی حرکتیں وہ مزے لے لے کر مجھے سُنایا کرتے۔ ایک بار انھوں نے مجھ سے ایک کتاب کا ذکر کیا جو اس عمارت کے مکیں ایک کامریڈ کے پاس تھی اور جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ کمیونسٹ بننے کی دعوت کس کس قسم کے لوگوں کو کس کس طرح دینی چاہیے۔ مجھے اس کتاب کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا اور میں ساحر کا ہمیشہ ممنون رہوں گا کہ یہ انھوں نے مجھے حاصل کر دی۔

میں نے کمیونسٹوں کے حق میں اور اُن کے خلاف بہت کچھ پڑھا ہے لیکن اس سے زیادہ انکشاف انگیز کتاب میری نظر سے کبھی نہیں گزری۔ کتاب میں نظریاتی مباحث مطلق نہیں تھے۔ صرف یہ بتایا گیا تھا کہ مختلف قسم کے لوگوں کی کمزوریوں اور احساسِ شکست خوردگی سے کس طرح فائدہ اُٹھایا جائے۔ یہ طریق کار وہی تھا جو جرائم پیشہ ٹولیاں ممبر بھرتی کرنے کے لیے اختیار کرتی ہیں۔

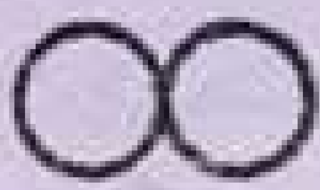
پنجاب کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری اقبال سنگھ سے بھی میری ملاقات ساحر ہی کی وجہ سے ہوئی۔ میں اور ساحر ایک ریستوران میں بیٹھے تھے کہ وہ بھی وہیں آ گئے۔ ساحر نے میرا تعارف کرایا اور جیسی کہ اس کی عادت تھی، میری شاعری کی مبالغہ آمیز تعریف کی۔ اقبال سنگھ نے مجھے ہفت روزہ "قومی جنگ" میں لکھنے کی دعوت دی تو میں نے معذرت کی اور دبے لفظوں میں یہ بھی بتا دیا کہ میں سیاسی طور پر کمیونسٹ پارٹی سے متفق نہیں ہوں اس پر انھوں نے مجھے تبادلۂ خیال کی دعوت دی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ملاقات تفصیل سے ہونی چاہیے اور یہ کہ کیا میں کمیونسٹ پارٹی کے دفتر میں آ سکتا ہوں۔ اقبال سنگھ کا شہرہ اُن دنوں یہ تھا کہ ہندوستان میں ایسے صرف آٹھ آدمی ہیں جو کمیونسٹ نظریے کو ماہرانہ طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ اور اقبال سنگھ ان میں سے ایک ہیں۔ بہرحال یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی کشتی مانگے اور میں فرار ہو جاؤں۔ میں نے دوسرے دن کمیونسٹ پارٹی کے دفتر میں پہنچنے کا وعدہ کر لیا۔

جیساکہ اُوپر لکھ چکا ہوں، میکلوڈ روڈ پر جس عمارت میں کیمونسٹ پارٹی کا دفتر تھا اس سے مَیں بخوبی واقف تھا لیکن اس دن مَیں اور ساحر وہاں پہنچے تو نقشہ ہی کچھ اور تھا دروازے پر ایک دیوہیکل کامریڈ دربان بنا کھڑا تھا۔ اُسے بمشکل ہی سے یقین آیا کہ کچھ ایسا ہیچ میرز کمیونسٹ پارٹی کے بلند مرتبہ سکرٹیری سے دوستانہ ملاقات کے لیے آسکتا ہے۔ وہ وہیں کھڑا رہا اور ایک کامریڈ کو تصدیق کے لیے اندر بھیجا۔ اندر سے جواب ہاں میں آیا تو میری خوش بختی پر رشک کرتا ہوا وہ مجھے اقبال سنگھ کے کمرے تک چھوڑ آیا۔

کمرے کے اندر کا ماحول بھی پُرشکوہ تھا۔ اقبال سنگھ کے سوا وہاں لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں۔ اقبال سنگھ بڑی تمکنت سے گویوں میں کاہن بنے بیٹھے تھے۔ اُن کے چہرے پر واقعی جلال تھا اور وہ اس اقبال سنگھ سے کافی مختلف نظر آتے تھے جس سے گزشتہ روز ریستوران میں میری ملاقات ہوئی تھی۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد انھوں نے مجھ سے اپنے خیالات بیان کرنے کو کہا تو میں نے ابتدا یہاں سے کی کہ مارکس نے تاریخی عوامل کے متعلق جو پیشین گوئیاں کی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں۔ اس صورت میں یہ کیسے یقین کیا جاسکتا ہے کہ اسٹالن کے فیصلے صحیح ہوں گے۔ پھر میں نے سوویت خارجہ پالیسی پر کچھ کہنا شروع کیا۔ معاً اقبال سنگھ بولے۔ متّل صاحب میرا خیال تھا کہ آپ کو اختلاف ہمارے ساتھ ہے لیکن آپ کا اختلاف تو بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں آپ سے کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ میں مصافحہ کرکے وہاں سے اٹھ آیا لیکن اُٹھتے اُٹھتے اتنا ضرور کہہ آیا کہ مَیں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتا تو اس سے اختلاف کیا رکھوں۔ یہ ساحر کی عالی ظرفی تھی کہ باہر آکر وہ مجھ سے خفا نہیں ہوئے بلکہ اقبال سنگھ کا مذاق ہی اڑاتے رہے۔

ساحر روگ پالنے والا آدمی نہیں اور کیمونسٹ پارٹی سے ان کی وابستگی بھی تفریحی سطح پر تھی۔ نظریاتی بحث میں میرے ساتھ وہ کبھی نہیں اُلجھے۔ اگر میرے سامنے کسی کیمونسٹ کو زچ ہوتے دیکھتے تو ایک خبیثانہ سی مسرت بھی محسوس کرتے۔ بعد میں یہ ضرور کہتے: "متّل صاحب آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن کوئی تمھارے اور تمھاری پارٹی کے ساتھ کیوں آئے؟ تمھارے پاس ہے ہی کیا؟ کیمونسٹ جس ادیب کا ہاتھ پکڑتے ہیں اُسے شہرت کی چوٹی پر پہنچا دیتے ہیں۔" یہ اُن کی نوازش تھی کہ مجھ سے ان کی دوستی

بہر حال قایم رہی - انھوں نے میرے خلاف دُشنام طرازی میں شرکت نہیں کی - اور نجی طور پر اپنے کامریڈوں کے پاس میری تعریف ہی کرتے رہے یہ وہ ضرور چاہتے تھے کہ میں راہ راست پر آجاؤں - کہا کرتے تھے : کمیونسٹ کہتے ہیں ایک بار اپنے دوست سے ہاں کہلوا دو پھر دیکھو ہم اسے کس بلندی پر لے جاتے ہیں - لیکن نہ میں نے ہاں کہی اور نہ کمیونسٹوں نے مجھے بلندی پر پہنچانے کا جتن کیا -



ابراہیم جلیس

شب کی مملکت میں دن کا سفیر

ساحر لدھیانوی اور ابراہیم جلیس مرحوم میں بڑی گہری دوستی تھی۔ جب ابراہیم جلیس ۱۹۵۹ء کے اوائل میں حیدر آباد دکن سے پاکستان واپس جاتے ہوئے بمبئی پہنچے تو ساحر لدھیانوی سے بھی ملے۔ اس مضمون میں اسی ملاقات کا حال انھوں نے بیان کیا ہے جس سے ساحر کی شخصیت کے بعض دیگر پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ان کی شاعرانہ انا پر خاص روشنی پڑتی ہے۔ یہ مضمون 'نگار' کراچی کے فروری ۵۹ء کے شمارے میں شایع ہوا تھا۔

اردو ادب میں ساحر لدھیانوی کا نام بہت بڑا ہے اور بمبئی کی ٹیلی فون ڈائرکٹری میں ساحر لدھیانوی کا نام بہت باریک ہے۔ ڈائرکٹری میں ساحر کا نام دیکھ کر دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔

"ساحر لدھیانوی چینائی نواس سات بنگلہ اندھیری ۵۸ ٹیلی فون نمبر ۸۶۸۵۷"

میں نے بڑی بے تابی سے ٹیلی فون کا ڈائل گھمایا۔

"ہیلو کڈ آئی اسپیک ٹو مسٹر ساحر لدھیانوی؟"

جواب آیا۔ "ساحر اسپیکنگ۔"

میں نے صرف یہ جاننے کے لیے کہ آیا چودہ سال کے بعد بھی ساحر میری آواز پہچانتا ہے یا نہیں۔ اس سے کہا۔

"دیکھیے ساحر صاحب میں آپ کی شاعری کا بڑا مداح ہوں اور آپ سے ملنا۔۔۔"

ابھی میں نے جملہ بھی مکمل نہ کیا تھا کہ اُدھر سے ساحر کی آواز آئی، ساحر جیسے چیخ پڑا۔

"ادئے جلیس کے نیچے۔"

اس کے لہجے میں بھی جیسے دل کی دھڑکن تھی وہ بڑی بے قراری سے بولا۔ "تم اس وقت کہاں سے بول رہے ہو حیدرآباد سے یا گلبرگہ سے؟"

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ۱۴ سال کی طویل جدائی کے بعد بھی ساحر نے میری آواز پہچان لی۔ میں نے جواب دیا۔

"نہ تو حیدرآباد سے بول رہا ہوں اور نہ گلبرگہ سے، یہیں بمبئی سے بول رہا ہوں، پلیٹن روڈ کے ہوٹل امپریل سے۔"

ساحر نے کہا۔

"بمبئی آکر ہوٹل میں ٹھہرے ہو تو مجھ سے ملنے کے لیے نہ آنا۔" مگر جلد ہی اسے اپنی یہ شرط یاد نہ رہی اور اس نے کہا۔ "میں اپنی کار بھیج رہا ہوں تم اس کار میں سیدھے شری ساؤنڈ اسٹوڈیو پہنچو۔ میں دوسری کار میں وہاں پہنچ رہا ہوں اور تمھارا رُخِ زیبا دیکھنے کے لیے بہت بے تاب ہوں۔"

ٹیلی فون بند ہوگیا۔ امپریل ہوٹل سے اٹھارہ میل دُور اندھیری سے ساحر کی گاڑی آنے والی تھی۔ میں ساحر سے ملنے کے لیے بیتاب ہوگیا۔ مگر ساحر کے انتظار میں ساحر ہی کا گیت گا کر انتظار کی کٹھن گھڑی میں دل بہلا رہا تھا۔

امپریل ہوٹل کے سامنے والے ایرانی ہوٹل کے ریڈیو پر سیلون کا پروگرام ہو رہا تھا اور اس میں ساحر لدھیانوی کے گیت نشر کیے جا رہے تھے۔

زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات
ایک انجان حسینہ سے ملاقات کی رات

گیارہ بجے کے قریب میرے کمرے میں ایک شخص بغیر اجازت کے داخل ہوا اور

میں نے ناگواری کے لہجہ میں پوچھا۔

"کون ہو تم ؟"

اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"تکارام ۔"

اور ایک پرچہ میری طرف بڑھا دیا وہ پرچہ ساحر لدھیانوی کا تھا۔ تکارام ساحر کا ڈرائیور تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"صاحب نے بولا ہے دو بجے تک شری ساؤنڈ اسٹوڈیو لے آؤ۔ صاحب اُدھر دو بجے پہنچے گا۔"

دو بجنے میں بہت دیر تھی اس لیے میں نے سوچا کہ دو بجے تک میں کیوں نہ پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز عرف پی آئی اے کے دفتر سے واپسی کے لیے ٹکٹ حاصل کر لوں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ تکارام بولا۔

"صاحب نے یہ بھی بولا ہے آپ کو جہاں بھی جانا ہے ہم آپ کو لے جائے ۔"

"لے جائے تو پھر لے جائے۔ چلو پھر ذرا ایئر لائنز پی آئی کے دفتر۔"

پی آئی اے کے دفتر سے واپسی کا ٹکٹ نہیں مل سکا لیکن پی آئی اے والوں نے بحری جہاز سابرمتی سے میری واپسی کا بندوبست کرا دیا۔ سابرمتی جہاز ۲۰ اگست کو بمبئی سے کراچی جانے والا تھا اور اس دن ۱۳ اگست تھی یعنی مجھے اپنے خوابوں کے شہر بمبئی میں رہنے کے لیے پورے ایک ہفتہ کی مہلت مل گئی تھی اور میں بہت خوش تھا کہ ایک ہفتہ کے اندر مجھے بمبئی کی ادبی، صحافتی اور فلمی دُنیا کو اچھی طرح سے دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔

ڈھائی بجے میں بمبئی کے مشہور فلم اسٹوڈیو شری ساؤنڈ اسٹوڈیو پہنچا۔ کار سے اُترتے ہی ایک شخص میری طرف بڑھا اور پوچھا۔

"آپ مسٹر ابراہیم جلیس ہیں ؟"

اس شخص کی شکل مشہور فلم ہیرو شیکھر سے ملتی جلتی تھی مگر وہ شیکھر نہیں تھا اردو کا ایک مشہور افسانہ نگار پرکاش پنڈت تھا۔

میں ایک دیوانے کی طرح پرکاش پنڈت سے لپٹ گیا۔ پرکاش پنڈت سے کوئی بارہ برسوں سے میری نہایت بے تکلفانہ خط و کتابت تھی لیکن اس سے دو بدو ملاقات

کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بڑی دیر تک ہمارے دل ایک ساتھ دھڑکتے رہے۔

پرکاش پنڈت نے بتایا کہ :

"شہزادہ (ساحر لدھیانوی اپنے دوستوں میں شہزادے کے نام سے مشہور ہے۔) اندر پروجکشن ہال میں ایک فلم کے رشز دیکھ رہا ہے اس فلم کی نمایش سنسر بورڈ نے ممنوع قرار دے دی ہے اور اب بمبئی فلم سنسر بورڈ نے رپورٹ کے لیے یہ فلم بمبئی رائٹرز ایسوسی ایشن کے حوالے کی ہے۔ اور اپنا شہزادہ فلم رائٹرز ایسوایشن کا نائب صدر ہے۔"

میں یہ سُن کر حیران رہ گیا کہ ہندوستان میں فلم رائٹرز یعنی فلم لکھنے والوں کی کتنی عزت ہے۔ بمبئی کا سنسر بورڈ رپورٹ کے لیے ایسی فلم بھی اُن کو دکھاتا ہے جس کی نمائش اس نے ممنوع قرار دی ہے۔

پرکاش پنڈت کے ساتھ میں پروجکشن ہال میں داخل ہوگیا۔ پروجکشن ہال میں اندھیرا تھا اور سامنے پردۂ سیمیں پر اس فلم کے رشز دکھائے جارہے تھے۔

اندھیرے میں ساحر لدھیانوی کی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن ابھی ساحر سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ساحر غالباً اس فلم کے پروڈیوسر اور ڈائرکٹر کو یہ ہدایتیں دے رہا تھا کہ اس منظر سے یہ حصّہ کاٹ دیجیے، اس رقص کو نکال دیجیے، اس رقص کو فلاں فلاں جگہ سے دوبارہ ایڈٹ کیجیے وغیرہ وغیرہ۔

میں بڑا متعجب بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ ایک ہم بھی فلم رائٹر ہیں اور ہمارے فلم ساز ہماری ہی لکھی ہوئی فلم کے بارے میں ہماری ہی تنقید کی کوئی پروا نہیں کرتے۔

فلم ختم ہوئی۔ پروجکشن ہال میں اُجالا ہوا تو میں ساحر کی طرف اور ساحر میری طرف بڑی بے تابی سے بڑھا۔ چودہ سال کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے ملے تھے اور ہم دونوں کی صحت قابلِ رشک ہوگئی تھی۔ اب سے چودہ سال پہلے ہم دونوں مفلس اور اُردو ادب کے امراض کے باعث نہایت دُبلے پتلے تھے۔ اب ساحر بھی کافی موٹا ہو چکا تھا اور اس کے چہرے پہ تازگی کی دمک تھی۔

ساحر لدھیانوی کو فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کا بہت کام تھا لیکن، اس نے اپنے سیکرٹری سے کہا۔ "آج میرا چودہ سال پُرانا دوست آیا ہے آج میں کوئی کام نہیں کروں گا۔"

ساحر لدھیانوی، پرکاش پنڈت اور میں اس پروجکشن ہال سے باہر نکلے تو بہت سے

ادبی اور فلمی ادیب، نئے نغمہ نگار راجہ مہدی علی خاں، قمر جلال آبادی، مکالمہ نگار ورجیندر گوڑ، پروڈیوسر ڈائریکٹر ایکٹر کشور ساہو، ایکٹریس نندا اور سادھنا وغیرہ ملے۔ ساحر اسٹوڈیو میں جدھر سے گزرتا لوگ اُسے بڑے ادب سے سلام کرتے۔

فلمی دُنیا میں ایک گیت نگار کی یہ عزت! میرا دل اندر سے بہت خوش ہو رہا تھا کہ ساحر نے فلمی دُنیا میں بھی ادیبوں اور شاعروں کے مقام کو سرمایہ دار فلم سازوں کے ہم پلّہ بنا رکھا ہے۔ چار بج رہے تھے۔ ساحر نے کہا۔

"چلو چلیں تمھاری آمد کی خوشی میں ایک ٹی پارٹی ہو جائے۔" مَیں نے کہا "نہیں پہلے دیو آنند سے ملیں گے پھر چائے پئیں گے۔"

ساحر نے کہا کہ دیو آنند کسی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں باہر گیا ہوا ہے ملنا ہے تو سنیل دت سے مل لو۔ وہ جے دیو کے گھر آنے والا ہے۔

سنیل دت، نرگس کے شوہر سے میری ملاقات نہیں تھی۔ جے دیو بھی بڑا پیارا آدمی ہے۔

طے یہ ہوا کہ ہم جے دیو کے گھر چل رہے ہیں وہیں چائے پئیں اور جے دیو سے بھی مل لیں۔

جے دیو کا فلیٹ بھی چرچ گیٹ کے علاقہ میں ہے ہم وہاں سے چرچ گیٹ روانہ ہو گئے۔

میوزک ڈائریکٹر جے دیو کوئی بہت مشہور میوزک ڈائریکٹر نہیں ہے۔ مگر ساحر لدھیانوی کے بارے میں ہندوستان کی فلم انڈسٹری میں یہ مشہور ہے کہ وہ ہندوستان کی فلمی دُنیا کو نئے میوزک ڈائریکٹروں سے روشناس کراتا ہے۔

یہ انکشاف میرے لیے بڑا عجیب سا تھا۔

ہمارے مُلک میں بلکہ ہندوستان میں بھی یہ عام طریقہ ہے کہ فلم ساز پہلے میوزک ڈائریکٹر کا انتخاب کرتا ہے اور شاعر کا انتخاب میوزک ڈائریکٹر کی مرضی پر چھوڑ دیتا ہے۔

فلمی دُنیا میں بالعموم میوزک ڈائریکٹر کا شاعر سے کہیں زیادہ مقام ہوتا ہے جب کوئی فلم بنتی ہے اور کوئی ڈسٹری بیوٹر یعنی فلم کا تقسیم کار اُسے خریدنا چاہتا ہے تو صرف یہ پوچھتا ہے کہ "میوزک ڈائریکٹر کون ہے؟"

نوشاد ہے ؟

ایس، ڈی، برمن ہے ؟

شنکر جے کشن ہے ؟ کون ہے ؟

کوئی ڈسٹری بیوٹر یہ نہیں پوچھتا کہ گیت کس نے لکھے ہیں۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ساحر لدھیانوی اور مجروح سلطان پوری نے فلمی دُنیا کی اس روایت کو بالکل ہی اُلٹ کر رکھ دیا ہے۔ جس فلم میں ساحر لدھیانوی اور مجروح سلطان پوری کے گیت ہوتے ہیں تو فلم خریدنے والا یہ نہیں پوچھتا کہ فلم کا میوزک ڈائرکٹر کون ہے۔ ان دونوں کے نام ہی پر فلم گرم کیک کی طرح بک جاتی ہے۔

یہ بات کبھی تصور میں بھی نہیں آسکتی کہ فلمی دُنیا میں شاعر بھی کسی میوزک ڈائرکٹر کے ہم پلّہ ہو جائے گا۔ بلکہ میوزک ڈائرکٹر اپنی وقعت کھو بیٹھے گا۔

پرکاش پنڈت نے مجھے شاعر کے اس مقام کا بڑا ہی دلچسپ منظر بتایا۔ پرکاش نے کہا:

فلم "بازی" میں ساحر کے گیت تھے اور میوزک ڈائرکٹر ایس، ڈی، برمن تھے۔ جب فلم "بازی" کے سارے گیت بقول فلم والوں کے ہٹ ہوگئے تو ایک دعوت میں ساحر اور برمن میں چونچیں لڑ گئیں، برمن نے ساحر سے کہا۔

"کیا ہیں تمھارے گیت ——— دراصل میری طرزیں ہیں جن کی وجہ سے گانے مقبول ہوئے۔"

ساحر نے اسی وقت عہد کیا کہ وہ کسی مشہور میوزک ڈائرکٹر کے لیے گیت نہیں لکھے گا اور فلمی دُنیا کو یہ بتادے گا کہ شاعر میوزک ڈائرکٹر سے کہیں بڑا ہوتا ہے۔

چنانچہ اس کے بعد سے آج تک ساحر اپنے عہد پر قائم ہے۔ اس نے نئے میوزک ڈائرکٹروں کو پکڑا اور نہ صرف انھیں فلمی دُنیا سے متعارف کرایا بلکہ آج انھیں نوشاد، ایس، ڈی، برمن، سی رامچندر اور شنکر جے کشن کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔

فلم "بازی" کے بعد ساحر نے کسی بڑے سکہ بند قسم کے میوزک ڈائرکٹر کے ساتھ کام نہیں کیا لیکن اس کے باوجود ساحر کے گیت آج ہندوستان میں زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ مثال کے طور پر ساحر کا یہ گیت:

زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات

ہندوستان اور پاکستان میں جگہ جگہ گونج رہا ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں اس گیت کا میوزک ڈائرکٹر کون ہے مگر سبھی یہ ضرور جانتے ہیں کہ یہ گیت ساحر لدھیانوی کا لکھا ہوا ہے۔

حتیٰ کہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فلم "برسات کی رات" معیار کے اعتبار سے کوئی قابلِ ذکر فلم نہیں مگر وہ فلم صرف اسی ایک گیت کے باعث سینما گھر سے اُترتی ہی نہیں تھی۔

شاعر کے اس مقام کا ترقی پسند ہدایت کار اور فلمساز گرودت نے عملی اعتراف کے طور پر شاعر کی بلکہ ساحر کی زندگی پر ایک نہایت کامیاب اور بہت ہی معیاری فلم "پیاسا" کے نام سے بنائی۔

اور یہ کہنا بھی کسی طرح غلط نہیں کہ فلم "پیاسا" محض ساحر لدھیانوی کی ادبی نظموں کے باعث ایک نہایت کامیاب فلم ہے جو اس حقیقت کا ایک ثبوت ہے کہ آج کل کی ہندوستان کی فلمی دُنیا اب پرانے ٹیپکل فلمی گیتوں کے بجائے صرف ایسے گیتوں کی وجہ سے مترنم ہے جو بیک وقت فلمی بھی ہیں اور ادبی بھی۔ آج ہندوستان کی فلمی دُنیا میں :

او جانے والے بالموا۔ لوٹ کے آ، لوٹ کے آ

کو کوئی نہیں پوچھتا۔ آج کے ہندوستان میں اس قسم کے فلمی گیت گونج رہے ہیں :

جانے وہ کیسے لوگ تھے جن کے پیار کو پیار ملا
ہم نے تو جب کلیاں مانگیں کانٹوں کا ہار ملا

کھل گئے راز کئی، بات کچھ بن ہی گئی
جانے کیا تونے کہی جانے کیا میں نے سُنی
بات کچھ بن ہی گئی، جانے کیا تونے کہی

ساحر اور مجروح جیسے شاعروں سے پہلے فلمی دُنیا میں اس بات کی گنجائش ہی نہ تھی کہ ٹھیٹ ادبی نظمیں فلموں میں بھی جگہ پاسکیں لیکن آج سارے ہندوستان میں ساحر کی مشہور ادبی نظم "چکلے" فلم کے ذریعے گونج رہی ہے۔

ملاحظہ فرمائیں :

یہ کوچے یہ نیلام گھر دل کشی کے
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں کہاں ہیں محافظ خودی کے
جنھیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں

آج ایسی بلند پایہ نظمیں فلمی گیتوں کا قالب اختیار کر کے سنگیت اور شاعری کے معیار کو اوجِ ثریا تک پہنچائے ہوئے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج ہندوستان میں "مرزا غالب" کی زندگی بھی فلم کا موضوع بن سکتی ہے۔

آج ہندوستان کا رکشہ والا، بوٹ پالش والا اور گھوڑا گاڑی والا ایسے گیت نہیں گاتا کہ:

پیپل کے پیڑ تلے میں بھی ملوں تم بھی ملو
منظور تمھیں ؟ . . . . منظور

بلکہ وہ غالب کی غزل گاتا ہے۔

ادبی شاعری کا فلمی دُنیا میں مقام!
حیرت ہے — باعثِ رشک ہے!!

پرکاش پنڈت نے شاعر اور میوزک ڈائرکٹر کے علاوہ شاعر اور گلوکارہ کی چپقلش کا بھی ایک بڑا ہی دل چسپ واقعہ سُنایا۔

لتا منگیشکر آواز کی دیوی ہے اور بلاشبہ وہ برصغیرِ پاک و ہند میں ساحر لدھیانوی سے کہیں زیادہ مشہور و مقبول ہے۔ ہر فلمساز کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ لتا منگیشکر کے زیادہ سے زیادہ گانے اس کی فلم میں ہوں۔ فلم خریدنے والا سب سے پہلے یہ بھی پوچھتا ہے کہ آپ کی فلم میں لتا منگیشکر نے کتنے گانے گائے ہیں۔

ہر شاعر کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ اس کا گیت لتا منگیشکر گائے۔

ساحر کی بھی ابتدا میں یہی خواہش تھی اور لتا نے ساحر کے متعدد گانے بڑے شوق اور عقیدت کے ساتھ گائے لیکن ایک دن کسی فلم ساز نے ساحر اور لتا کی موجودگی میں ساحر سے کہا۔

" ساحر صاحب! اگر لتا کی آواز نہ ہو تو آپ کے گیت بھی بے جان ہیں "

ساحر ——— ایک خوددار اور ادبی شاعر ——— ! اسے تاؤ آگیا اور اس نے لتا منگیشکر اور اس فلمساز کے سامنے یہ حلف اٹھایا کہ :

" جب تک میں یہ ثابت نہ کر دکھاؤں گا کہ اچھی ادبی شاعری لتا منگیشکر کی آواز کی محتاج نہیں ہے۔ لتا منگیشکر میرا ایک گیت بھی نہیں گائے گی۔" چنانچہ اس کے بعد ساحر کا جس فلم کمپنی سے معاہدہ ہوتا تو وہ پہلی شرط یہ رکھتا تھا کہ :

میرا کوئی گیت لتا منگیشکر نہیں گائے گی۔"

ظاہر ہے کہ کوئی فلمساز لتا منگیشکر کو نظر انداز کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا وہ ساحر لدھیانوی کو تو ٹکا سا جواب دے سکتا تھا لیکن لتا کو کسی قیمت پر بھی نظر انداز نہ کر سکتا تھا۔

مگر ساحر لدھیانوی نے ہمت نہ ہاری اور پورے دو سال تک اس کا کوئی گیت لتا منگیشکر نے نہ گایا۔ اس کے باوجود ساحر کے گیت سُدھا ملہوترہ جیسی غیر معروف گانے والی کی آواز میں انہی اونچائیوں میں گونجتے رہے جہاں تک صرف لتا منگیشکر کی آواز پہنچ سکتی تھی۔

میں بُت بنا فلمی دُنیا میں ادبی شاعر کے اس اعزاز پر غور کر رہا ہوں۔ ساحر لدھیانوی کار چلا رہا ہے اور مُسکراتے ہوئے کہہ رہا ہے۔

" اب لتا منگیشکر سے میری پھر دوستی ہو گئی ہے اب دوستی صحیح معنوں میں ہو گئی ہے۔ دوستی دراصل دو برابر کے آدمیوں میں ہوتی ہے۔"

OO

فِکرُ و فَن

شاعری پر مضامین

مسعود منور
جاں نثار اختر
ناز صدیقی

مسعود منور

فراق اور احتجاج کا شاعر

میں ساحر سے بہت بچپن میں تو نہیں کہنا چاہیئے اپنے لڑکپن میں متعارف ہوا تھا۔ ہائی اسکول کی نویں جماعت میں تھا۔ یہ ۵۰ء کی دہائی کا آخری حصہ رہا ہوگا کہ میرا تعارف "تاج محل" سے ہوا۔ تاج محل میں نے نہیں دیکھا۔ ہندوستان میں چھ ماہ گزار کر بھی نہیں دیکھ سکا۔ لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تاج محل میرے لڑکپن کی گمشدہ یاد ہے۔ ایک ایسی یاد جس کے سوتے ساحر کی شاعری سے پھوٹتے ہیں۔ ساحر کی نظم "تاج محل" آج بیس برس گزر جانے کے بعد بھی صحاف صحاف مجھے زبانی یاد ہے۔ اپنے ان ہم جماعتوں کے صبیح اور ملیح چہروں کی طرح جن کی آنکھوں میں شرارت اور معصومیت باہم ہو کر فطرت کا ایک عجیب معمّا بن جاتی ہے اور سکول کے کمپاؤنڈ میں کھیل کے وقفے کے دوران ایک دوسرے پر پھینکی ہوئی بے ساختہ مسکراہٹوں میں حنوط ہو جاتی ہے۔ یہی حنوط مسکراہٹ زمستاں میں پہاڑوں پر برف کے پھول کھلاتی ہے اور میدانوں میں یاسمین کی جھاڑیوں پر تتلیوں کی طرح منڈلاتی کسی شریر بالک کی چٹکی میں رنگ کا سپنا بن کر اُسے حیران کر دیتی ہے۔ ایسی تھی ساحر کی شاعری۔

جی ہاں وہ تتلی میں نے بھی پکڑی تھی، غمگین اور الم رسیدہ تتلی، اس کے رنگ میری اُنگلیوں پر ابھی تک تازہ ہیں۔ میں انھیں دیکھتا ہوں تو مترنم مصرعوں کے لاوے

میرے احساس کے تاروں کو مرتعش کرنے لگتے ہیں۔ کتنا حسین ارتعاش ہے :

چند کلیاں نشاط کی چن کر
مدّتوں محوِ یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اُداس رہتا ہوں

ساحر کو میں نے نہیں دیکھا، اس سے نہیں ملا۔ میں اُسے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سے ملنا چاہتا تھا۔ مگر کیوں اس لیے کہ اُس نے اُردو شاعری اور میرے لڑکپن کو رنجیدہ اور غم زدہ رہنا سکھایا تھا۔ وہ میر کی طرح قنوطی نہیں تھا۔ وہ تو امنِ عالم کا بہت بڑا شارح اور ترجمان تھا۔ نہیں وہ باغی اور سرکش تھا۔ اور محبت کو سرکشی اور منہ زوری پر اُکساتا تھا۔ اس نے فاحشہ عورتوں کو تقدّس کا جہیز دینا چاہا۔ اس نے ظلم کے خلاف ایک تیز اور دل دوز چیخ بلند کی۔ ایسی لامتناہی اور مترنم چیخ جس کی بازگشت ازل سے ابد تک مسلسل ہے۔ اس کی نظم 'چکلے' اور مشہور گیت جس کے بول درج ذیل ہیں، اسی چیخ کی جزئیات ہیں :

عورت نے جنم دیا مردوں کو مردوں نے اُسے بازار دیا
جب جی چاہا مسلا کچلا، جب جی چاہا دھتکار دیا

یہ شاعری نہیں احتجاج ہے۔ ساحر احتجاج کا شاعر ہے۔ میں کب تک اس کی شاعری کی مختلف جہتوں کے نام تلاش کرتا رہوں گا۔ اس کی شاعری کے ہزار پہلو ہیں۔ جس طرح زندگی کے ہزار روپ ساحر نے خود کہا ہے :

ہر ایک ہاتھ میں لے کر ہزار آئینے
حیات بند دریچوں سے بھی گزر آئی

ساحر کی شاعری میں دو بڑے کلیدی رویّے، دو متوازی ندیوں کی طرح خراماں خراماں دکھائی دیتے ہیں ایک ندی اس کی ذات ہے۔ محروم، دکھی، پریشان، محبت کی پیاس سے ہلکان اور آتشِ عشق سے خاکستر بنی ہوئی جس کا استرہ فراق ہے۔ یعنی جدائی اور دُوری۔ ساحر اپنے ذاتی حوالے سے صرف فراق کا شاعر ہے اور اس ندی کے متوازی بہنے والی ندی اجتماعی نظریات کی ندی ہے۔ جہاں وہ

استحصالی سماشرے سے بغاوت اور نئی سماج کی تعمیر، رومانیت، عورت کی آزادی اور انسانی حقوق کا شہد کھلاتا ہے اور یہ شہد لفظوں کے توسل سے سماعتوں میں گھُل کر انسانی زندگی کو اُمیدوں اور آشاؤں کے خواب دیتا ہے۔ ساحر اپنے قلم کو ایک آدرش کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتا تھا اور اسے اپنی ذمہ داری کا احساس تھا۔ وہ آئیڈیلسٹ ترقی پسندوں کی طرح محض فردا کے سبز باغوں کی تدوین میں منہمک نہیں تھا بلکہ اپنے نظریے کی عملی تکمیل میں انسانی مستقبل کی نجات ڈھونڈتا تھا۔ اسے اپنے عمل پر یقین تھا۔ بلا کا یقین۔ وہ کہتا ہے :

مانا کہ اس زمیں کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم تو کر گئے گزرے جدھر سے ہم

——— ساحر

اپنی ذات کے حوالے سے ساحر ایک تنہا فرد تھا۔ اس کی تنہائی، کوئی نظریاتی کلیشے نہیں۔ بلکہ وہ ناکام محبتوں کا مارا، ایک مجرد شخص تھا جو ازدواجی زندگی کے تجربے کو نہ پہن سکا۔ کبھی اس نے امرتا پریتم سے محبت کی، کبھی کسی اور نام سے، اور کبھی کسی اور نام سے، لیکن یہ نام ساحر کی لوح مقدر کی زینت نہ بن سکے۔ لیکن وہ اپنی زندگی کے بنجر اور شور میں ایک بے ثمر جھنڈ کی تمثال تھا۔ وہ اپنی کائناتِ شعر کا "واحد" تھا، "احد" نہیں تھا۔ "احد" وہ ہوتا ہے جو نہ کسی سے جنا گیا ہو اور نہ ہی کوئی اس سے جنا جائے۔ عبدالحئی ساحر خود تو جنا گیا، لیکن اس کی ذات کے شجر پر گیتوں اور چینخوں کے سوا کوئی پھول نہ آسکا۔ مجھے ببول کا وہ اکیلا درخت یاد آیا ہے جو اپنے زرد پھولوں اور سُرخ نوک والے ——— نقرئی کانٹوں کے گہنے پہنے بیابانِ زیست میں کسی مافوق الوجود محبوبہ کے مرمریں لمس کا منتظر تھا۔ اس ببول نے انتظار کی طویل اور کٹھن دوپہر کو گیتوں کا سائبان پہنایا اور اپنے لہو سے اپنے خوابوں کو سینچتا رہا۔ اس ببول کے خواب کتنے سُندر تھے۔

حقیقتیں ہیں سلامت تو خواب بہتیرے
ملول کیوں ہو جو کچھ خواب رائگاں نکلے

ساحر اپنی ذات سے بے حد مربوط اور بے حد کٹا ہوا شاعر ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے وہ پر ہجوم ہے، لیکن بچھڑا ہوا ہے۔ وہ بیک وقت موضوع اور معروض سے

منسلک ہے۔ اس کا تخلیقی کام تناقضات کے عجائبات کا حیرت کدہ ہے۔ بظاہر اس کی نظموں اور غزلوں کے مصرعے اپنی ساخت کے اعتبار سے سادہ اور ترکیبیں انتہائی سہل ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کے اظہار کے سانچے گہری جذباتیت کے زہر میں بجھے ہیں۔ سائنا میڈ سے تیز یہ تخلیقی زہر نوجوان ذہنوں کو لمحہ بھر میں ملوث کر کے جذباتی ہلاکت میں ڈال دیتا ہے۔ مثلاً یک سوئی کے یہ اشعار دیکھیے:

میں تصوف کے مراحل کا نہیں ہوں قائل
میری تصویر پہ تم پھول چڑھاتی کیوں ہو
ایک سرکش سے محبت کی تمنا رکھ کر
خود کو آئین کے پھندوں میں پھنساتی کیوں ہو
جب تمھیں مجھ سے زیادہ ہے زمانے کا خیال
پھر مری یاد میں یوں اشک بہاتی کیوں ہو
تم میں ہمت ہے تو دُنیا سے بغاوت کر دو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

یہ اشعار پُرتکلف صنعتوں، تشبیہوں اور استعاروں سے عاری ہیں۔ زبان انتہائی سہل ہے، اضافتوں کی بھاری بھرکم آلودگی دکھائی نہیں دیتی، بلکہ ان مصرعوں میں سرے سے اضافت کہیں لگی ہی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود ایک بنیادی جذبہ ایسا ہے جس نے ایک ایک لفظ کو ایک ایک انگر بنا دیا ہے اور پوری نظم دہکتے ہوئے سُرخ انگاروں کا ایک انبار ہے جس کے پڑھنے سے زبان جل جاتی ہے اور ایک یا دو بار یہ مصرعے گنگنانے سے مُنہ میں چھالے پڑنے لگتے ہیں۔ نظم کا آخری شعر عورت کے نام ایک بغاوت کا پیغام ہے۔ لیکن اسی پیغام میں کہیں ایک IMPOTENT RAGE کا احساس بھی شامل ہے۔ جیسے کہنے والا خود ایک انفعالیت کے احساس سے دوچار ہو۔ یہ انفعالیت ساحر کی شخصیت کا باطنی طلسم ہے جس نے اُسے عمر بھر تنہا رکھا۔

میں نے دیکھا نہیں سُنا ہے کہ ساحر پی کر بُری طرح بہکتے۔ اور اذیت پسند بن جاتے تھے۔ بمبئی کی پُر شور راتیں ان کی اس اذیت پسندی کی گواہ ہیں۔ لیکن ساحر جب تک لاہور میں رہے ان سے کوئی ایسی بے کیف روایت وابستہ نہ ہو سکی۔ لاہور میں وہ ترقی پسندوں کے ترجمان ماہ نامہ "سویرا" کے مدیر تھے۔ وہ تقسیم کے بعد بھی پنجاب کے اسی ثقافتی شہر سے وابستہ رہے اور جب پاکستان میں ترقی پسندوں، کمیونسٹوں اور بائیں بازو کے دانشوروں پر پابندی لگا دی گئی تو وہ پاکستان کو خیر باد کہہ کر ہندوستان چلے آئے۔ ہندوستان نے انھیں خوش آمدید کہا اور اپنی گود میں لے لیا۔ جہاں ان کی زندگی تنہائی کی چتا میں دھیرے دھیرے سلگ کر تاں کار ۱۹۸۰ء کی اس آخری سہ ماہی میں بجھ گئی۔ اس بجھتے ہوئے ماحول میں ساحر کی آواز اب تک آ رہی ہے:

اُف وہ بے درد سیاہی وہ ہوا کے نوحے
کس کو معلوم ہے اس شب کی سحر ہو کہ نہ ہو
اک نظر تیرے دریچے کی طرف دیکھ تو لوں
جاگتی آنکھوں میں پھر تابِ نظر ہو کہ نہ ہو

ساحر کی شاعری ہندوستانی ثقافت کا ایک موروثی انگ ہے۔ وہ اقبال اور فیض کی شعری روایت کے درمیان ایک کڑی کی طرح آویزاں ہے لیکن اس نے اپنے مقامی وجود سے قریب رہ کر فارسی کی پُر تکلف ترکیبوں اور اضافتوں کی بھرمار سے اجتناب برتا جبکہ فیض نے انتہائی فارسی آمیز زبان میں شاعری کی ہے۔ یعنی ایک پُر تکلف پرشنائزڈ فارم میں فیض اپنے مصرعوں کی ساخت میں بے حد AESTHETE ہیں۔ وہ جمالیاتی التزام کو پوری طرح سامنے رکھتے ہیں۔ جب کہ ساحر نے صرف اس درد اور کرب کو لفظوں میں بے ساختگی سے تصویر کیا ہے۔ جو اُسے اجتماع یا MOB سے تجربے کی شکل میں ملا ہے۔ ساحر کہتے ہیں:

دُنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ساحر کی نظمیں سہلِ ممتنع کی شعری صفت سے زیادہ کمیونی کیشن یا ابلاغ کے معرکے ہیں۔ جن میں ایک فرد دوسرے فرد سے ہمکلام نظر آتا ہے۔ چنانچہ ساحر اپنے لہجے میں سوال کرتا ہے :

ملیں کیا اس لیے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں
کہ دخترانِ وطن تار تار کو ترسیں
چمن کو اس لیے مالی نے خوں سے سینچا تھا
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں
زمیں نے کیا اسی کارن اناج اُگلا تھا
کہ نسلِ آدم و حوا بلک بلک کے مرے
——— قحطِ بنگال

تو اس سوال کے آئینے میں ایک قحط زدہ مفلس کا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ چہرہ ایک طبقاتی تقسیم کا ستیڈرڈل بیان کرتا ہے اور ساحر کی شاعری کو ایک مخصوص سماجی نظریے سے منسلک کر دیتا ہے۔

ساحر کی ان طبقاتی نظموں کا آہنگ کہیں کہیں خطابیہ ہے اور کہیں کہیں بیانیہ قحطِ بنگال کا آغاز غایت درجہ خطابیہ رنگ سے ہوا ہے :

جہانِ کہنہ کے مفلوج فلسفہ دانو!
نظامِ نو کے تقاضے سوال کرتے ہیں
یہ شاہراہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا
کہ ان پہ دیس کی جنتا سِسک سِسک کے مرے

ساحر کی ریڈرشپ بہت وسیع تھی، اس کے اشعار مزدور سبھاؤں، ادبی جلوس شبستانوں کی گنگناہٹوں اور نقادوں کی تنقیدوں میں یکساں دلچسپی کے ساتھ گونجتے تھے۔ لیکن فلم کی ترویج کے بعد شاعری کے لیے کاغذ کا رول ختم ہو چکا تھا اور سلولائیڈ کا عہد آ چکا تھا، ساحر نے اپنی طبقاتی شاعری کو فلم میں موسیقی کا لباس

پہنا کر اُردو اور ہندی جاننے والوں کے ہر اس حلقے تک پہنچا دیا جو کرۂ ارض کے کسی بھی منطقے میں آباد ہے۔

ساحر کی شاعری فلمی مزاج پر پوری طرح اثر انداز ہوئی اور آج کے گیتوں پر ساحر کے اثرات بے حد واضح ہیں اور شدت سے محسوس کیے جاتے ہیں۔ ساحر بطور فلمی شاعر ایک علیحدہ موضوع ہے، جس پر پھر کبھی اظہارِ خیال کروں گا۔ فی الوقت ساحر کے چند اشعار پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ ان اشعار میں اس نے جنگ بازی کے جنون کی مذمت کی ہے اور امن کی خواہش کہ وقت کی آواز ہے:

بم گھروں پر گریں کہ سرحد پر
روحِ تعمیر زخم کھاتی ہے
کھیت اپنے جلیں کہ اوروں کے
زیست فاقوں سے تلملاتی ہے
اس لیے اے شریف انسانو!
جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے
آپ اور ہم سبھی کے آنگن میں
شمع جلتی رہے تو بہتر ہے

○○

جاں نثار اختر

ساحر کی نغمہ نگاری

ساحر جب ایک گیت نگار کی حیثیت سے فلم انڈسٹری میں داخل ہوا اُس وقت عام طور پر فلمی گیتوں کا معیار اس حد تک ادنیٰ اور پست ہو چکا تھا کہ محض رکیک قسم کی تُک بندی کو گیت نگاری کی معراج سمجھا جانے لگا تھا۔ بنگال کی ہندی فلموں میں آرزو نے گیتوں کو جو روپ اور سنگھار بخشا تھا وہ بمبئی کے "فلمی شاعروں" کے ہاتھوں لُٹ چکا تھا۔ اُن دنوں یہ پروپیگنڈا کہ فلمی گیت کہنا بڑے ادیبوں اور شاعروں کے بس کی چیز نہیں ہے، اتنا عام ہو چکا تھا کہ بہت سے پڑھے لکھے پروڈیوسر اور ڈائرکٹر بھی ذہنی طور پر اس کا شکار نظر آتے تھے، حد یہ ہے کہ ان بکواس گیتوں کے جواز میں یہ کہا جاتا تھا کہ ہم کیا کریں آج کل پبلک یہی مانگتی ہے اور یہ بات وہ لوگ کہتے تھے جنھیں کبھی عوام سے رابطے کی توفیق نہیں ہوئی تھی اور نہ کبھی انھوں نے پبلک پلیٹ فارم پر آنے کی جُرأت کی۔

ان حالات میں ساحر کے قلم نے ایک بار پھر گیتوں کے معیار کو اُبھارنے اور سنوارنے کی جو کوشش کی، اُس نے نہ صرف اُس زہر آلود پروپیگنڈے کا ابطال کیا، بلکہ فلمی گیتوں کو ذہنی گندگی اور غلاظت سے نکال کر ستھری اور نکھری ادبیت سے دوبارہ روشناس کرایا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ فلمی شاعری کا کسی طرح بھی بدل ہو سکتی ہے لیکن فلمی گیتوں میں ادبی رنگ کو میں عذر دری سمجھتا ہوں۔ یہی ادبی رنگ ہے جو گیتوں کو ایک طرف حُسنِ بیان عطا کرتا ہے تو دُوسری طرف تخئیل کی لطافت اور جذبات کی پاکیزگی بخشتا ہے۔ فلمی شاعری کی تکنیک بھی ادبی شاعری کی تکنیک سے مختلف ہوتی ہے۔ فلم کی حیثیت ایک ڈرامہ کی ہے اور گیت اس ڈرامہ کے منظوم ٹکڑے ہیں۔ فلمی گیت نگار کو مختلف موقع و محل کے مطابق مختلف کرداروں کے لیے گیت کہنے ہوتے ہیں، یہ گیت کبھی فراق کی داستاں کہتے ہیں، تو کبھی آپس کی چھیڑ چھاڑ کو دوہراتے ہیں۔ کبھی کوئی طوائف یا کسی کیفے کی کوئی حسینہ سامانِ تفریح کے طور پر انھیں گاتی ہے، کبھی یہ لوری بنتے ہیں تو کبھی بچّوں کے معصوم جذبات کا اظہار، کبھی یہ دُنیوی مصائب کی پکار ہیں تو کبھی مزاح و ظرافت کی خوش آہنگ جھنکار، کبھی اس پردے میں دُنیا کی بے ثباتی کی بات ہوتی ہے تو کبھی یہ انسانی جدوجہد کے جوشیلے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں کبھی یہ موت کا راگ ہیں تو کبھی زندگی کا بھرپور نغمہ۔ اس اعتبار سے فلمی شاعری کا بہت وسیع دائرہ ہے۔ لیکن اصل سوال تو یہ ہے کہ گیت کہنے والا کہاں تک کامیابی کے ساتھ اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوا ہے۔ ایک طوائف کے گیت میں پست اور رکیک جذبات بھی کہے جا سکتے ہیں اور یہی گیت نازک عاشقانہ جذبات کا حامل بھی ہو سکتا ہے اسی طرح کیفے میں گانے والی لڑکی ایک مہذب گیت بھی گا سکتی ہے اور یہی گیت کنایہ اور محاکات کے انداز میں ایک خوبصورت دعوتِ عشق بھی بن سکتا ہے۔ مزاحیہ گیتوں میں گھٹیا قسم کی باتیں بھی کہی جا سکتی ہیں یا پھر اُن میں طنز شامل کر کے انھیں ادبی ظرافت کا نمونہ بھی بنایا جا سکتا ہے۔ غرض "کیا کہا گیا ہے؟" کا سوال بہت اہم ہے اور پھر اسی کے ساتھ "کیسا کہا گیا ہے" کا سوال بھی جُڑا ہوا ہے جس میں شاعر کے لیے قدرتِ بیان کے علاوہ بلاغت کے پورے اصولوں کو جاننا لازمی ہو جاتا ہے ایک نقطہ جو فلمی شاعری میں بہت اہمیت رکھتا ہے، وہ گیتوں میں عام مقبولیت (POPULAR APEAL) کا خیال رکھنا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ چیز آسان زبان اور عام فہم بیان کے ساتھ ساتھ گیتوں میں بھرپور جذباتیت کا مطالبہ کرتی ہے۔ بغیر جذباتی عنصر کے کسی گیت کو شہرت اور مقبولیت حاصل ہونا ممکن نہیں ہوتا۔

فلمی گیتوں کی تکنیک کے سلسلے میں یہ امر خصوصاً قابلِ اظہار ہے کہ گیت نگار

کو بنی بنائی دھنوں پر موقع و محل کے اعتبار سے الفاظ بٹھانے ہوتے ہیں۔ گیتوں کی تاریخ کو اُٹھا کر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ لوک گیتوں کی تشکیل میں موسیقی اور شاعری کے دھارے بیک وقت مل کر پھوٹتے رہے، آگے چل کر گیتوں اور نغموں کی تخلیق کی جو عام صورت نظر آتی ہے وہ یہ کہ شاعر یا کوی کی کہی ہوئی چیزوں کی دھنیں مرتب کی جانے لگیں۔ فلمی دُنیا میں معاملہ برعکس ہے۔ عام دستور یہ ہو گیا ہے کہ میوزک ڈائرکٹر دھن پہلے تیار کر لیتا ہے بعد میں شاعر اس پر بول کہتا ہے۔ اس کی وجہ اگر ایک طرف موجودہ شاعروں کی موسیقی سے نا واقفیت ہے تو دوسری طرف اکثر میوزک ڈائرکٹروں کی اپنی کمزوریاں بھی ہیں جو کہے ہوئے بولوں کی طرزیں بناتے ہوئے گھبراتے ہیں اور کتراتے ہیں، بہر حال ابتدا میں شاعر کو بڑی عرق ریزی اور جگر سوزی سے کام لینا ہوتا ہے، کچھ عرصے میں دھنوں کے پیچ و خم دوسروں کے زیر و بم کو سمجھنے کی اہلیت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ شاعری اور موسیقی کا ازلی رشتہ ہے۔ شاعر اگر موسیقی داں نہ ہو تو بھی اسے موسیقی سے ایک ذہنی ربط ضرور ہوتا ہے چاہے وہ کتنا ہی پست شعور کیوں نہ ہو۔ اس ذہنی تربیت کے بعد اُس کے لیے کسی دُھن پر بھی بول کہنا اتنا ہی آسان اور سہل ہو جاتا ہے جتنا عروض کے مقررہ اوزان پر غزل یا نظم کی تخلیق کرنا لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اس بندش کے ساتھ خوبصورت اور کامیاب گیت لکھنا ایک کامیاب شاعر ہی کا کام ہے۔

آیئے ساحر کے کچھ گیتوں کا جائزہ لیں جو اس وقت کتابی شکل میں ہمارے اور آپ کے سامنے آئے ہیں اس مجموعہ کا ایک گیت "چاند مدھم ہے آسماں چپ ہے" ایک ادبی شہ پارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ انتظار کی کرب آلود کیفیت اور محبوب کو دیکھنے کی بے پایاں حسرت جس طرح ان سیدھے سادے الفاظ میں سموئی ہوئی ہے، اس نے اس گیت کو ایسی فضا اور ایسا تاثر بخش دیا ہے جو دلوں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔

روز کی طرح آج بھی تارے
صبح کی گرد میں نہ کھو جائیں
آ ترے غم میں جاگتی آنکھیں
کم سے کم ایک رات سو جائیں

چاند مدھم ہے آسماں چُپ ہے
نیند کی گود میں جہاں چُپ ہے

اسی طرح ساحر کا یہ گیت:

آنکھ کھلتے ہی تم چھپ گئے ہو کہاں
تم ابھی تھے یہاں
ابھی سانسوں کی خوشبو ہواؤں میں ہے
ابھی قدموں کی آہٹ فضاؤں میں ہے
ابھی شاخوں پہ ہیں اُنگلیوں کے نشاں
تم ابھی تھے یہاں

ان لطیف احساسات کی ترجمانی کرتا ہے جو محبوب کے تصور یا تخیل کو متشکل کر کے زندگی سے معمور کر دیتے ہیں۔

فلمی گیتوں کا ایک عام موضوع محبت کا پہلا احساس بھی ہے۔ ساحر نے اس موقع پر ایک لڑکی کے نازک جذبات کی ترجمانی کی ہے اس طرح:

نین جھک جھک کے اُٹھے
پاؤں رُک رُک کے اُٹھے
آ گئی چال نئی
بات کچھ بن ہی گئی
زلف شانے پہ مُڑی
ایک خوشبو سی اُڑی
کھُل گئے راز کئی
بات کچھ بن ہی گئی

ساحر نے ہجر و فراق کے موضوع پر بھی بڑے دل گداز گیت کہے ہیں:

جانے وہ کیسے لوگ تھے جن کو پیار سے پیار ملا

میری عمر سے لمبی ہو گئی بیرن رات جدائی کی

تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے

اُس کا یہ گیت "سُن جا دل کی داستاں" ہندوستان گیر شہرت حاصل کر چکا ہے، الفاظ اور جذبات کی خوب صورتی گیتوں کے لیے بڑی اہم ہے جو دُھن ساحرؔ کو اس گیت کے لیے دی گئی ہو گی اس پر "آجا آجا بالما" بھی موزوں کیا جا سکتا تھا لیکن یہیں ایک شاعر اور تُک بند کا فرق سامنے آتا ہے۔ ساحرؔ ایک باشعور شاعر ہے اور اس لیے اس کے ان گیتوں میں بھی جو غمِ جاناں پر مشتمل ہیں یہیں غمِ دوراں کی جھلکیاں مل جاتی ہیں:

تم نے کتنے سپنے دیکھے، مَیں نے کتنے گیت بُنے
اس دُنیا کے شور میں لیکن دل کی دھڑکن کون سُنے

حُسن کے کھِلتے پھول ہمیشہ بیدردوں کے ہاتھ بِکے
اور چاہت کے متوالوں کو دھول ملی ویرانوں کی
دل کے نازک جذبوں پر بھی راج ہے سونے چاندی کا
یہ دُنیا کیا قیمت دے گی سادہ دل انسانوں کی

یہ حقیقت ہے کہ ساحرؔ کے گیتوں کی سب سے نمایاں خصوصیت اُس کا ترقی پسندانہ مواد PROGRESSIVE CONTENT ہے۔ اُس نے بڑی جرأت و قوت کے ساتھ اپنے گیتوں میں یہ آواز اُٹھائی ہے، وہ ایک بیدار اور پختہ شعور لے کر فلمی دُنیا میں داخل ہوا ہے اُس کی پہلی ہی فلم "بازی" میں اُس کا یہ نغمہ ذہنوں کا چونکا دینے والا تھا۔

ڈرتا ہے زمانے کی نگاہوں سے بھلا کیوں
انصاف تیرے ساتھ ہے الزام اُٹھا لے
ٹُوٹے ہوئے پتوار ہیں کشتی کے تو کیا غم
ہاری ہوئی باہنوں کو ہی پتوار بنا لے

یہ آواز اور یہ آہنگ فلمی گیتوں کی دُنیا کے لیے نیا تھا اور پھر ساحرؔ اپنی اس

آواز کو روز بہ روز تیز کرتا گیا اور آج وہ کھل کر اپنے سماجی شعور کو پوری فن کارانہ نزاکتوں کے ساتھ اپنے گیتوں میں پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے گیتوں میں "یہ دُنیا جہاں آدمی کچھ نہیں ہے" کو ٹھکراتا ہوا ملتا ہے۔ اُس کے گیتوں میں ان لاوارث اور بیکس بچّوں کی آواز سُنائی دیتی ہے جن کے لیے سڑکیں ہی ماں اور سڑکیں ہی پِتا کا حکم رکھتی ہیں۔ اُس کے گیتوں میں اُس عورت کی چیخ ہے جو "اوتار پیمبر" جنتی ہے پھر بھی شیطان کی بیٹی ہے" اُس کے گیتوں میں اُن مزدوروں کی بات ہے جن کی محنت کے بل بوتے پر دُنیا کی تمام مادی آسائشیں اور آرائشیں مہیا ہیں " ماٹی سے ہم لعل نکالیں، موتی لائیں جل سے" ساحر محنت کا استحصال EXPLOITATION برداشت نہیں کرتا اور اسی لیے اس کے گیت میں یہ نعرہ کھُل کر گونج اُٹھتا ہے " ہاتھ بڑھا کر چھین لو اپنے سپنوں کی تعبیریں" وہ سرمایہ داری پر بھرپور ضرب لگاتا ہے، ایک گیت میں اس نے اس تفریق کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے جو سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کی پیداوار ہے۔ جس میں ہر فرد کو پنپنے اور پروان چڑھنے کے لیے برابر کے مادّی ذرائع و مواقع حاصل نہیں ہیں اور جس کے نتیجے میں اگر ایک کی تقدیر سُکھ ہے تو دوسرے کی دُکھ:

دو کلیاں گلشن کی
اک سہرے کے بیچ گندھے اور من ہی من اترائے
اک ارتھی کی بھینٹ چڑھے اور دھول میں مل جائے
کس کو مجرم سمجھے کوئی کس کو دوش لگائے

دو سکھیاں بچپن کی
اک سنگھاسن پر بیٹھے اور روپ متی کہلائے
دُوجی اپنے روپ کے کارن گلیوں میں بک جائے
کس کو مجرم سمجھے کوئی کس کو دوش لگائے

ساحر ایسے ناحق اور غیر مساوی نظام کا دشمن ہے۔ اُس کی پُر امید طبیعت اس اندھیرے کو چھٹتا ہوا محسوس کرتی ہے اور وہ چلا اُٹھتا ہے "کس کے روکے رُکا ہے سویرا" وہ عمل اور ردِ عمل کے فطری اور سائنسی اصول سے واقف ہے:

مثلاً :

رات جتنی بھی سنگین ہوگی
صبح اتنی ہی رنگین ہوگی
غم نہ کر گر ہے بادل گھنیرا
کس کے روکے رُکا ہے سویرا

اپنے گیت 'رات کے راہی' میں صبح نو کی بشارت اس طرح دیتا ہے :

دھرتی کے پھیلے آنگن میں پل دو پل ہے رات کا ڈیرا
ظلم کا سینہ چیر کے دیکھو جھانک رہا ہے نیا سویرا
ڈھلتا دن مجبور سہی، چڑھتا سورج مجبور نہیں
رات کے راہی تھک مت جانا صبح کی منزل دور نہیں

اور پھر "وہ صبح کبھی تو آئے گی" میں ان تمام مصائب و آلام کے ختم ہونے کا یقین دلاتا ہے جو آج زہر بن کر ہمارے سماج کی رگوں میں سرایت کیے ہوئے ہیں :

یہ نرک سے بھی گندی دُنیا جب سورگ بنائی جائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

کوئی شک نہیں کہ ساحر کا یہ کارنامہ ہے کہ اُس نے فلموں کو ایسے گیت دیے جو سیاسی اور سماجی شعور سے لبریز ہیں، یہ ایک بڑا قدم ہے جو ساحر نے بڑی دلیری سے اُٹھایا۔ وہ ہمارے بعض دوسرے شاعروں کی طرح فلمی دُنیا کی گندگی میں ڈوب کر نہیں رہ گیا بلکہ اس نے اپنے قلم کی قوت سے فلمی گیتوں کو اگر ایک طرف حُسن کی لطافت اور نزاکت اور عشق کا درد اور کسک بخشی تو دُوسری طرف سماجی مادّی اور اقتصادی شعور دیا، اُس نے خود کو دھوکا دیا نہ اپنے فن کو ——— نہ عوام کو، اس نے وہ کیا جو بحیثیت ایک بیدار شاعر اُس کا فرض تھا۔ اور اس کے اس کارنامے پر میں اسے مبارک باد دیتا ہوں!

OO

ناز صدیقی

ساحر کا اُسلوب

زبان:

ساحر کا شمار ان چند گنے چُنے ترقی پسند شاعروں میں ہوتا ہے، جن کی شاعری میں زبان کا استعمال محض خیالات کی ترسیل، عقائد کی تبلیغ اور سیاسی پروپیگنڈے کے لیے نہیں ہوا بلکہ انھوں نے اسے اپنے محسوسات اور جذبات کی صورت گری کا ایک ذریعہ بنایا ہے ساحر نے تشبیہہ استعارے اور کنایہ کی زبان بھی استعمال کی ہے ساتھ ہی ساتھ اظہار کے بیانیہ اور خطیبانہ پیرایوں سے بھی کام لیا ہے وہ زبان کو اظہار کے ساتھ ترسیل کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

اسی لیے ساحر کی زبان اور اظہار ترچھا اور پُر پیچ نہیں بلکہ بالعموم راست اور واضح ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں علامتوں کا استعمال نہیں ملتا اور ذہنی مرکب تمثیلی پیکر ملتے ہیں۔ یہ اکہری سطح کی شاعری ہے اس میں بیانیہ عناصر بھی نمایاں ہیں اس کے باوجود ساحر کی نظمیں سادہ اور سپاٹ نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ استعاروں اور کنایوں سے بہت زیادہ کام لیتے ہیں لیکن اس طرح کہ ابہام کہیں نہیں آنے پاتا۔ ساحر کی شاعری میں اگرچہ ابہام سے پیدا ہونے والے حُسن کی کمی ہے اور اس میں تجربے کی گہری سطح بھی نہیں ملتی لیکن وہ جذبے کی شدت، تخیّل کی گلکاریوں اور اسلوب کی دل کشی کے ذریعہ اس کمی کو پورا کرتے ہیں۔ اس

کے قطع نظر ساحر کو زبان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عجز بیان سے پیدا ہونے والے ابہام کا وہ کبھی شکار نہیں ہوئے۔ وہ زبان کا استعمال تخلیقی انداز سے کرتے ہیں اور یہ بات اعلیٰ قوتِ متخیلہ کے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔ ساحر کی زبان اور اظہار کے مخصوص پیرایوں کا مطالعہ ان کے اسلوب کی تحسین کے لیے ضروری ہے۔

ان کی شاعری مرصع سازی ہے جس میں الفاظ نگینوں کی طرح جڑے نظر آتے ہیں۔ وہ الفاظ کا انتخاب نہایت موزونیت کے ساتھ کرتے ہیں، ان کے کلام میں کہیں بھرتی کے یا غیر موزوں الفاظ نہیں ملتے، نہ ہی نارواتعقید ملتی ہے۔ ان کے مصرعے اور اشعار خوب صورتی کے ساتھ ترشے ترشائے اور ڈھلے ڈھلائے ہوتے ہیں۔ ساحر کی لفظیات میں عام طور پر فارسی اور ہندی الفاظ کا متوازن امتزاج ملتا ہے۔ بعض نظموں میں ہندی لفظیات اور بعض میں فارسی فرہنگ کی کثرت ان نظموں کے جذباتی ماحول اور مجموعی فضا سے مطابقت رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر نظم "آج اور کل" کی لفظیات میں ہندی عنصر غالب نظر آتا ہے۔ بوندیں، بادل، کوی، آکاش، سپنے، رُت، مدھ، نکھیت، بنسی، چڑیاں جھنڈ، پینگ، سیندور، جوہڑ، امرت، ہل، پونجی، بنیا، جنتا، برکھا وغیرہ اس کے برخلاف نذرِ کالج اور بعض دوسری نظموں میں فارسی آمیز فرہنگ کی بہتات ملے گی۔ "نذر کالج" کی لفظیات کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ سرزمینِ پاک، یارانِ نیک نام، شاعرِ آوارہ، وادیِ جمیل جنتِ خیال، نشاط خیز، دورِ خزاں، ننگِ وطن، حدِ وطن، نغماتِ آتشیں، نشاطِ روح مورد الزام، لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں زیادہ تر نظموں میں ہندی اور فارسی الفاظ کا استعمال توازن اور ہم آہنگی کے ساتھ ہوا ہے اور وہ اس طرح باہم شیر و شکر ہو گئے ہیں کہ کہیں پیوند کاری کا احساس نہیں ہوتا۔ نظم نگاری کے لیے ساحر نے جو زبان استعمال کی ہے وہ مجموعی طور پر غزل کی زبان سے مختلف ہے ان کی عشقیہ نظموں میں غزل کی لفظیات ضرور مل جاتی ہے لیکن ساحر کی نظم فیض کی طرح غزل زدہ نہیں ہے۔ محسوس نہیں ہوتا کہ شاعر بنیادی طور پر غزل گو ہے اور غزل کی زبان اور غزل کے آرٹ کو نظم میں برت رہا ہے۔ غزل کی جو فرہنگ ساحر نے استعمال کی ہے اس کا نمونہ یہ ہے: سوزِ دل، شمعِ آرزو، مشقِ ستم، تغافل، وفا، فریبِ شوق، جادۂ منزل، بہارِ گلشن، اغیار، فصل، زنداں، لیکن ایسے الفاظ اور ترکیبیں ساحر کی نظموں میں بہت

تلاش کے بعد خال خال ہی نظر آئیں گی۔

ساحر کی شاعری کے مطالعہ کے بعد ان کی شاعری کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے وہ یہ کہ انھوں نے غزل اور نظم کے لیے علیحدہ علیحدہ علائم استعمال کیے۔ ساحر نے غزل میں نئے علائم استعمال کیے ہیں اور روزمرہ کے الفاظ کو نئے مطلب اور معانی عطا کیے۔

ساحر نے اپنی اکثر نظموں میں بیانیہ اور ایمائی اسالیب کو یکجا کر دیا ہے اور ان نظموں میں انھوں نے پیکر تراشی سے کام لیا ہے۔ پیکروں سے ساحر نے محاکات نگاری اور حکایت طرازی کا کام بڑی ہنرمندی سے لیا ہے۔

محاکات نگاری اور پیکر تراشی:

قدیم مشرقی تنقید اور اردو تنقید میں بھی محاکات کو شاعری کے عناصر میں شمار کیا گیا ہے محاکات کا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ کسی شے یا واقعے یا کیفیت کو اس طرح پیش کیا جائے کہ اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ تنقید کی جدید اصطلاح میں امیجری جسے پیکر تراشی کہا جاتا ہے محاکات سے مماثلت رکھتی ہے لیکن ان کے مقاصد میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ پیکر تراشی کا مقصد کسی تجربے کو محسوس بنا دینا ہے۔ بعض شاعروں اور نقادوں نے شاعری کا اصل کام یہ قرار دیا ہے کہ اس میں اشیا کو ان کے "شے پن" کے ساتھ پیش کیا جائے ان کے خیال میں شاعری افکار و خیالات کے اظہار کا ذریعہ نہیں ہے۔ عینیت پسند فلسفی اس بات میں یقین نہیں رکھتے کہ اشیاء اپنا وجود رکھتی ہیں فنونِ لطیفہ اصلی پیکر سے از خود تشکیل پاتے اور معصومیت کی ابتدائی عمر میں اُبھرتے ہیں۔ امیجسٹ خود کو پیکروں میں تحلیل کر کے سائنس سے فرار چاہتے ہیں۔ شاعری کے اس نظریے کو پوری طرح قبول نہ بھی کیا جائے تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پیکر شعر کی خاص زبان ہے شاعری میں تمام اجزائے کلام اوصاف نگاری کا کام انجام دیتے ہیں یہاں تک کہ فعل بھی شاعری میں فعل باقی نہیں رہتا بلکہ وہ بھی وصف بن جاتا ہے۔ شاعری میں فعل کا نہ تو حقیقت میں کوئی زمانہ ہوتا ہے نہ ہی کسی معین مخاطب کو کچھ کرنے یا نہ کرنے کی ہدایت اس میں ہوتی ہے۔ اقبال کی نظم "کنارِ راوی" کے اس شعر میں فعل کا زمانہ حال حقیقی زمانۂ حال نہیں ہے:

سرِ کنارۂ آبِ رواں کھڑا ہوں میں
خبر نہیں مجھے لیکن کہاں کھڑا ہوں میں

اگر یہ حقیقی زمانے کو ظاہر کرتا تو راوی کے کنارے سے ہٹ جانے کے بعد شاعر اس کے صیغے کو تبدیل کر دیتا اور "ہوں" کو "تھا" سے بدل دیتا۔ اسی طرح نظم "فرمانِ خدا" میں فرشتوں سے خطاب حقیقت میں خدا کا فرشتوں سے خطاب نہیں ہے بلکہ محض شاعر کا ایک پیرایۂ اظہار ہے۔

ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر جس قسم کی سیاسی شاعری کو فروغ ہوا اس میں پیکر تراشی کی گنجایش کم تھی، استعارے اور تشبیہہ سے صرف خیالات کو مؤثر بنانے اور جذبات کو بھڑکانے کا کام لیا جاتا تھا۔ ساحر نے بیانیہ انداز کے ساتھ پیکروں کی زبان کو بھی اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ ان کی بعض نظمیں پیکر تراشی کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ پیکر تراشی کے لیے ساحر نے استعاروں اور صفات سے زیادہ کام لیا ہے۔

استعارے:

استعارے مختلف قسم کے ہوتے ہیں، استعارے کی ایک عام قسم یہ ہے کہ جس میں مشبہ کو حذف کر کے صرف مشبہ بہ کا ذکر کیا جاتا ہے جیسے غزل کی شاعری میں محبوب کے لیے گُل اور شمع کے استعارے ہیں یہ استعارے اسم ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ فعل وہ لایا جاتا ہے جس کا تعلق مشبہ سے ہوتا ہے۔

گُل کی جفا بھی دیکھی، دیکھی وفائے بلبل

اس میں جفا اور وفا محبوب اور عاشق کے افعال ہیں جنھیں گل اور بلبل سے نسبت دی گئی ہے اس قسم کے اسمی استعارے ساحر نے کم استعمال کیے ہیں اُردو غزل کے روایتی استعارے جیسے بہار و خزاں، خار و گُل، قفس و آشیاں، گُل و بلبل، شمع و پروانہ، ساحل و طوفاں، وغیرہ ساحر کے کلام میں نظر نہیں آتے۔ روایتی استعاروں سے چند ایک استعارے جیسے سحر شب نور ظلمت وغیرہ استعمال کیے ہیں لیکن فیض کی طرح ان کے تشبیہی علاقے بدل دیے ہیں۔ یہ استعارے جو روشنی اور تاریکی کو ظاہر کرتے ہیں ترقی پسند شعراء کے کلام میں عام طور پر نئے تشبیہی علاقوں کے ساتھ

ملتے ہیں لیکن خود ترقی پسند شعراء نے انھیں اس کثرت کے ساتھ استعمال کیاہے کہ وہ کلّی شے بن گئے ہیں یا اصطلاح کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ان استعاروں کو مقبول بنانے میں فیض کا بڑا حصّہ ہے۔ ساحر نے کہیں کہیں یہ استعارے استعمال کیے ہیں لیکن ان میں بھی ندرت و تنوع پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ فیض کی طرح ساحر نے ایسے استعاروں کو بندھے ٹکے مفہوم میں بار بار اس طرح نہیں دہرایا ہے کہ وہ اصطلاح بن جائے یہاں تک کہ بعض روایتی استعارے انھوں نے بالکل ہی نئے تشبیہی علاقے کے ساتھ اس طرح استعمال کیے ہیں کہ وہ نظم کے متن اور اس کے مرکزی خیال سے گہرا ربط رکھتے ہیں نظم سے ان کو الگ کر دیا جائے تو یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کا تشبیہی علاقہ کیا ہے اور زندہ استعارے کی اصلی پہچان یہی ہے۔ مثلاً ایک نظم میں انھوں نے "سیاہ اور سفید" کے استعارے باندھے ہیں، جو ایک روایتی پس منظر رکھنے کے علاوہ ترقی پسند شعراء کے ہاں مخصوص اصطلاحی مفہوم بھی رکھتے ہیں۔ ترقی پسند شعراء نے نور اور روشنی کے محروضات، کو آزادی خوش حال اور ترقی پذیر طاقتوں کا استعارہ بنایا ہے اس کے برعکس ظلمت اور اندھیرے کو ظاہر کرنے والے استعارے غلامی، جہل افلاس اور ظلم کا مفہوم رکھتے ہیں۔ سیاہ و سفید کے استعارے ساحر نے اپنی نظم "مفاہمت" میں کس طرح استعمال کیے ہیں۔

نشیبِ ارض پہ ذرّوں کو مشتعل پا کر
بلندیوں پہ سفید اور سیاہ مل ہی گئے
جو یادگار تھے باہم ستیزہ کاری کی
بہ فیضِ وقت وہ دامن کے چاک سِل ہی گئے

اس بند میں سیاہ اور سفید کے استعارے ایک سے زیادہ تشبیہی علاقے رکھتے ہیں جن کو سمجھنے کے لیے اس نظم کے سیاسی پس منظر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ ہندوستان کو آزادی دینے کے تعلق سے انگریز حکمراں ملک کی بڑی سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے گفتگو کر رہے تھے تاکہ کسی مفاہمت پہ پہنچیں وہ ہندوستان کو آزادی دینے پر اس لیے مجبور ہوئے کہ ہندوستانی عوام کی جدّوجہد شدّت اختیار کر گئی تھی۔ ہندوستان کو آزادی دینے کے ساتھ انگریز یہ چاہتے تھے کہ اپنا معاشی استحصال کسی دوسری شکل میں باقی رکھیں۔ پہلے مصرع میں "ذرّوں" کا استعارہ ہندوستان کے محنت کش

عوام کے لیے لایا گیا ہے۔ رنگ و نسل کے فرق کو ملحوظ رکھا جائے تو سفید کا اشارہ انگریز حکمرانوں اور سیاہ کا اشارہ ہندوستانی رہ نماؤں کی طرف محسوس ہوتا ہے۔ سفید اور سیاہ کو اگر نیکی بدی، حق و باطل مظلوم اور ظالم کا استعارہ سمجھا جائے تو سفید سے مُراد ہندستان کے سیاسی قائدین جو مظلوموں اور آزادی پسندوں کے نمائندوں کی حیثیت سے انگریزی حکومت کے نمائندوں سے آزادی کے مسئلے پر بات چیت کر رہے تھے اور سیاہ کا استعارہ انگریز سامراج کے لیے لایا گیا ہے جو ظلم و استحصال کی منفی قدروں کا حامل ہے۔ سیاہ اور سفید کا مل جانا ایک سازش کو ظاہر کرتا ہے جو ہندوستانی عوام کے خلاف کی گئی تھی۔ سیاہ اور سفید کا اختلاط ایک ایسی حالت کو پیش کرتا ہے جو تاریکی اور روشنی کے بین بین ہے۔ ہندوستانیوں کو جو آزادی ملی وہ بھی کچھ اسی نوعیت کی تھی۔ کہنے کو تو انگریزوں کا اقتدار ختم ہو چکا تھا لیکن ان کا معاشی تسلط اب بھی برقرار تھا گویا سیاہی پوری طرح مٹی نہ تھی۔ اس طرح ہندوستانیوں کو جو آزادی ملی وہ مکمل اور سچّی آزادی نہ تھی۔ گویا اُجالا دھندلایا ہوا تھا سفید اور سیاہ کا مل جانا کسی قدر کے باقی نہ رہ جانے کے مترادف بھی ہے۔ ان ہی استعاروں کو نظم کے آخری بند میں ایک مرکب پیکر کی صورت میں مرکوز کیا ہے :

یہ شاخِ نور جسے ظلمتوں نے سینچا ہے
اگر پھلی تو شراروں کے پھول لائے گی
نہ پھل سکی تو نئی فصلِ گل کے آنے تک
ضمیرِ ارض میں اک زہر چھوڑ جائے گی

گویا یہ آزادی ظلمتوں کی سینچی ہوئی شاخِ نور ہے اس میں ظلمتوں کا استعارہ انگریز حکمراں ہو سکتے ہیں اور ہندوستان کے سرمایہ دار بھی جن کے مفادات کا تحفظ کرنے کی ہمارے رہ نماؤں نے کوشش کی۔

ساحر کے وضع کردہ اسمی استعارے بھی ایسی ہی پیچیدہ نوعیت کے حامل ہیں۔ یہ استعارے ان کے تخیل کی تخلیقی قوت اور گہرے سیاسی شعور کے غمّاز ہیں۔ ذیل میں سادہ اور مرکب اسمی استعاروں کی چند اور مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

دیکھ! وہ مغربی افق کے قریب

آندھیاں پیچ و تاب کھانے لگیں
اور پرانے قمار خانے میں
کہنہ شاطر بہم الجھنے لگے

اسی بند میں دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں یورپ کے سرمایہ داروں کی باہمی آویزش کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اسمی استعاروں کے ساتھ کبھی وہ صفات کے اضافے کے ساتھ مرکب حسی پیکر تشکیل دیتے ہیں۔ مثلاً:

ریگزاروں میں بگولوں کے سوا کچھ بھی نہیں
سایۂ ابرِ گریزاں سے مجھے کیا لینا
——— شکست

یہ صدیوں سے بے خواب سہمی سی گلیاں
یہ مسلی ہوئی ادھ کھلی زرد کلیاں
——— چکلے

اے طربِ زارِ جوانی کی پریشاں تتلی
تو بھی اک بوئے گرفتار ہے معلوم نہ تھا
——— ایک تصویرِ رنگ

خاک پر رینگنے والے یہ فسردہ ڈھانچے
ان کی نظریں کبھی تلوار بنی ہیں نہ بنیں
——— جاگیر

تراکیب:

ساحر کے کلام میں زیادہ تر استعارے تراکیب کی صورت میں ملتے ہیں۔ انھوں نے تشبیہی اور توصیفی مرکبات کثرت سے استعمال کیے ہیں۔ خاص طور پر ہندی اضافت سے بننے والے مرکبات میں انھوں نے نئے نئے پیکر تراشے ہیں جیسے افق کا دریچہ، کہرے کی چادر، رات کا آنگن، عشرتوں کی شہنائی، عظمت کے ستون، شعاعوں کی لکیر، باہنوں کے جال، نغموں کی جھولی، بالوں کی ردائیں،

آداب کے سانچے، بچنوں کا انبار، سلاخوں کے شامیانے، جیون کی انگڑائی، صبح کے شکر، انصاف کے بُت، دل کا سیہ خانہ، رہ گزاروں کے زخم، دھرتی کا آنچل۔

بعض مرکباتِ اضافی سے بھی استعارے تشکیل پائے ہیں جیسے سانسوں کی تھکن، نگاہوں کا سکوت، ہوا کے نوحے، سڑکوں کی زبان، فضا کی سانسیں۔

فارسی تراکیب میں انھوں نے تخیّل کی تخلیقی قوّت سے کم کام لیا ہے فارسی مرکبات جو انھوں نے استعمال کیے ہیں زیادہ تر روایتی ہیں۔ ان سے کوئی نیا پیکر نہیں بنتا۔ بیشتر فارسی مرکبات کچھ اس طرح کے ہیں۔ خاکسترِ خاموش، جنّتِ خیال، شمعِ آرزو، حسنِ پشیماں، منزلِ ہستی وغیرہ لیکن کہیں کہیں ایسے مرکبات بھی مل جاتے ہیں جن سے ایک نئی تصویر سامنے آتی ہے اور جو ساحر کے مخصوص طرزِ فکر اور طرزِ احساس کا پتہ دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ تراکیب ملاحظہ ہوں۔ عروسِ آگہی بوئے گرفتار، ضابطۂ خودسری، حقوقِ ستم پروری، درگہہ مذہب و اخلاق، زعمِ قوّتِ فولاد و آہن، طاقِ تادیب، تلخابۂ تنہائی، فصیلِ آتش و آہن وغیرہ۔

اشعارِ ذیل میں تشبیہی اور توصیفی تراکیب کا استعمال ملاحظہ ہو:

اے آرزو کے دُھندلے خرابو جواب دو
پھر کس کی یاد آئی تھی مجھ کو پکارنے

—— غزل

اس طرف سے گزرے تھے قافلے بہاروں کے
آج تک سُلگتے ہیں زخم رہ گزاروں کے

—— غزل

صدیوں سے انسان یہ سُنتا آیا ہے
دُکھ کی دھوپ کے آگے سُکھ کا سایا ہے

—— صدیوں سے

رواں ہے چھوٹی سی کشتی ہواؤں کے رُخ پر
ندی کے ساز پہ ملّاح گیت گاتا ہے

—— پرچھائیاں

افق کے دریچے سے کرنوں نے جھانکا
فضا تن گئی راستے مسکرائے

―――――― ایک منظر

اف یہ بے درد سیاہی یہ ہوا کے نوحے
کس کو معلوم ہے اس شب کی سحر ہو کہ نہ ہو

―――――― خودکشی سے پہلے

ملیح چہرے پہ گردِ فسردگی کیسی
بہارِ غازہ سے عارض کو تازگی بخشو

―――――― میں نہیں تو کیا

سعیِ بقائے شوکتِ اسکندری کی خیر
ماحولِ خشتِ بار میں شیشہ گری کی خیر

―――――― طرحِ نو

نورِ سرمایہ سے ہے روئے تمدن کی جِلا
ہم جہاں ہیں وہاں تہذیب نہیں پل سکتی

―――――― مادام

افعال اور تشخص :

ساحر نے پیکر تراشی کے لیے متعلقات فعل کا استعمال بہت کم کیا ہے۔ ان کے کلام میں زیادہ تر متعلقات فعل زمان و مکاں کی وضاحت کے لیے آئے ہیں ایسے متعلقات بہت کم ہیں جن سے فعل کی کوئی حسیتی تصویر بنتی ہو۔ البتہ فعل سے تشکیل پانے والے استعارے بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔ اس نوع کی پیکر تراشی کی ایک مثال مختصر نظم " ایک منظر " ہے جس کا ہم تجزیہ کر آئے ہیں۔ ساحر کے اسلوب کا یہ ایک نمایاں وصف ہے کہ بے جان اشیا اور کیفیات کے ساتھ ایسے افعال لے آتے ہیں جن سے ان کا تشخص ہو جاتا ہے تشخص بھی استعارے کی ایک شکل ہے۔ اشعارِ ذیل میں اس نوع کے استعارے ملاحظہ ہوں :

سُلا گئی تھیں جنھیں تیری ملتفت نظریں
وہ درد جاگ اُٹھے پھر سے لے کے انگڑائی
ہر ایک ہاتھ میں لے کر ہزار آئینے
حیات بند دریچوں سے بھی گزر آئی

——— گریز

سرد شاخوں میں ہوا چیخ رہی ہے ایسے
روحِ تقدیسِ وفا مرثیہ خواں ہو جیسے

——— نورجہاں کے مزار پر

فضائیں سوچ رہی ہیں کہ ابنِ آدم نے
خرد گنوا کے جنوں آزما کے کیا پایا

(نیا سفر ہے پرانے چراغ گُل کردو)
ظلم پروردہ قوانین کے ایوانوں سے
بیڑیاں تکتی ہیں زنجیر صدا دیتی ہے

——— بشرطِ استواری

پینگ بڑھائی گوری کے ماتھے سے کوندے لپکیں گے
جوہڑ کے ٹھہرے پانی میں تارے آنکھیں جھپکیں گے

——— کل اور آج

کبھی تشخص کی بجائے دوسرے تشبیہی علاقے ہوتے ہیں جن کو استعارے میں ڈھالنے کے لیے کسی اسم کے ساتھ ایسا فعل لایا جاتا ہے جو اس کا اپنا نہیں بلکہ اور اسم کا فعل ہوتا ہے۔

مثلاً:

اس طرف سے گزرے تھے قافلے بہاروں کے
آج تک سلگتے ہیں زخم رہ گزاروں کے

——— غزل

تشخّص کی ایک عام صورت وہ ہے جس میں بے جان اشیا اور کیفیات کو

اس طرح مخاطب کیا جاتا ہے جیسے وہ ذی عقل ہوں۔ اس نوع کا تخاطب بیسویں صدی کے اوائل کی نظم نگاری میں عام تھا۔ اقبال کی بانگِ درا والی شاعری اور جوش کی نظموں میں اس کی کثیر مثالیں مل جائیں گی۔ اس اندازِ تخاطب کو اس دور میں اتنا فروغ ہوا کہ عام طور پر نظموں کا آغاز ہی "اے کہ تو" جیسے خطابیہ الفاظ سے ہوتا تھا۔ ترقی پسند شعرا نے بھی اس اسلوب کو اپنایا۔ ساحر نے اس کے استعمال میں توازن اور سلیقے کا ثبوت دیا ہے:

اے آرزو کے دُھندلے خرابو جواب دو
پھر کس کی یاد آئی تھی مجھ کو پکارنے
اب اے دلِ تباہ ترا کیا خیال ہے
ہم تو چلے تھے کاکلِ گیتی سنوارنے

——— غزل

مُسکرا اے زمینِ تیرہ و تار
سر اُٹھا اے دبی ہوئی مخلوق

——— لمحۂ غنیمت

صفات:

پیکر تراشی میں صفات سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ کسی اسم کے ساتھ اس کی اپنی صفات لائی جائیں تو محاکات نگاری ہو گی وہ شے زیادہ محسوس بن جائے گی لیکن اگر ایک اسم کے ساتھ دوسرے اسم کی صفت لگائی جائے تو استعارہ وجود میں آئے گا۔ اور نئے معنوی رشتے اُبھریں گے۔ ساحر کے کلام میں صفات کا استعمال زیادہ تر محاکات نگاری کے لیے ہوا ہے جہاں ان سے استعارے تشکیل دیے گئے ہیں وہ معنی خیز پیکر بن گئے ہیں۔ اوّل الذکر کی مثال یہ صفات ہیں۔

اندھیاری رات، بھیگی بھیگی سرد ہوا، حجاب آلود نظریں، تبسّم آفریں چہرہ، ملتفت نظریں، سرسراتے ہوئے پردے، منقش در و دیوار، ٹوٹا ہوا ساز جاگتی آنکھیں وغیرہ، استعاراتی صفات کا استعمال ذیل کے اشعار میں دیکھیے:

روندی کچلی آوازوں کے شور سے دھرتی گونج اٹھی ہے
دُنیا کے انیائے نگر میں حق کی پہلی گونج اُٹھی ہے

——— طلوعِ اشتراکیت

رات کی سرد خموشی میں ہر اک جھونکے سے
تیرے انفاس ترے جسم کی آنچ آتی ہے

——— ہراس

ڈھونڈتی رہتی ہیں تخئیل کی باہیں تجھ کو
سرد راتوں کی سلگتی ہوئی تنہائی میں

——— متاعِ غیر

صبح کے نور پہ تعزیر لگانے کے لیے
شب کی سنگین سیاہی نے وفا مانگی ہے

——— بشرطِ استواری

اور نغموں میں چھپا کر مرے کھوئے ہوئے خواب
میری روٹھی ہوئی نیندوں کو منا لائی ہے

——— تیری آواز

چند گھڑیوں کے لیے ہو کہ ہمیشہ کے لیے
میری جاگی ہوئی راتوں کو سُلا جائیں گے

——— تیری آواز

قمقموں کی زہر اُگلتی روشنی
سنگدل پرہول دیواروں کے سائے
آہنی بُت، دیو پیکر اجنبی!
چیختی چنگھاڑتی خونیں سرائے

——— ایک شام

جانے کب نکھرے سیہ پوش فضا کا جوبن
جانے کب جاگے ستم خوردہ بشر کی تقدیر

——— خودکشی سے پہلے

سہمی سہمی سی فضاؤں میں یہ ویراں مرقد
اتنا خاموش ہے فریاد کناں ہو جیسے
—— نورجہاں کے مزار پر

جیسا کہ ہم ابتدا میں کہہ آئے ہیں ساحر نے اپنی نظموں میں اظہار کے بیانیہ اور ایمائی پیرایوں کو یکجا کر دیا ہے کبھی وہ نظم کا آغاز کسی بیان (STATEMENT) سے کرتے ہیں جس میں کوئی تشبیہہ استعارہ یا علامت نہیں ہوتی لیکن مصرعوں کے بعد وہ ایما و اشاروں میں بات کرنے لگتے ہیں یا پیکر تراشی یا محاکات کے ذریعے اپنے جذبات و تجربات کی مرقع کشی کرتے ہیں پھر نظم کچھ آگے بڑھتی ہے پیکر تراشی کا عمل رک جاتا ہے اور دوبارہ براہِ راست خیالات کا اظہار ہونے لگتا ہے۔ مثلاً نظم بشرطِ استواری کا آغاز ان مصرعوں سے ہوتا ہے :

خونِ جمہور میں بھیگے ہوئے پرچم لے کر
مجھ سے افراد کی شاہی نے وفا مانگی ہے

اور اس بند کے باقی دو مصرعے خالص استعاراتی زبان میں ہیں :

صبح کے نور پہ تعزیر لگانے کے لیے
شب کی سنگین سیاہی نے وفا مانگی ہے

کبھی وہ اظہار کے اکہرے اور استعاراتی پیراؤں کو مخلوط کر دیتے ہیں ان کی مثال محولہ نظم کا یہ بند ہے :

ظلم پروردہ قوانین کے ایوانوں سے
بیڑیاں تکتی ہیں زنجیر صدا دیتی ہے
طاقِ تادیب سے انصاف کے بُت گھورتے ہیں
مسندِ عدل سے شمشیر صدا دیتی ہے

اس طرح ساحر کے کلام میں تشبیہات استعاروں اور صفات سے تراشے ہوئے پیکر بکثرت ملتے ہیں لیکن ایسی نظمیں خال خال ہی ہیں جو ایک مکمل حسّی مرقع ہیں۔ بعض نظمیں پیکر تراشی کے عمل سے شروع ہوتی ہیں لیکن بیانیہ عناصر کی وجہ سے نظم کے مختلف پیکر باہم مربوط نہیں ہونے پاتے۔ "لہو نذر دے رہی ہے حیات" کا آغاز

استعاراتی زبان میں ہوتا ہے جن سے چند بصری پیکر نظروں کے سامنے ابھرتے ہیں:

میرے جہاں میں سمن زار ڈھونڈنے والے
یہاں بہار نہیں آتشیں بگولے ہیں
دھنک کے رنگ نہیں سرمئی فضاؤں میں
افق سے تا بہ افق پھانسیوں کے جھولے ہیں

پھر اسی بند میں یہ اشعار بھی ملتے ہیں جن کا انداز بیانیہ ہے:

بلند دعوئ جمہوریت کے پردے میں
فروغِ محبس و زنداں ہے تازیانے ہیں
بنامِ امن ہیں جنگ و جدل کے منصوبے
بہ شورِ عدل تفاوت کے کارخانے ہیں

اس بند کے آخری شعر کی زبان پھر بدل جاتی ہے:

دلوں پہ خوف کے پہرے لبوں پہ قفلِ سکوت
سروں پہ گرم سلاخوں کے شامیانے ہیں

لیکن جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں ساحر کی چند نظموں کی تعمیر مربوط حسی پیکروں سے ہوئی مثلاً ایک منظر، ایک واقعہ، مفاہمت وغیرہ۔

ایک سرسری اندازے کے مطابق ساحر کے کلام میں زیادہ تر پیکر حسی بصارت کو متوجہ کرتے ہیں ان کے کلام میں رنگوں اور شکلوں کے پیکر بہت کم ہیں۔ اکثر بصری پیکر روشنی اور تاریکی کو ظاہر کرتے ہیں۔ وجہ غالباً یہ ہے کہ ترقی پسند شعراء نے سماجی اور طبقاتی تضاد اور متخالف اخلاقی قدروں کے اظہار کے لیے زیادہ تر انھیں استعاروں سے کام لیا ہے۔ بصری پیکروں کے بعد لمسی اور سمائی پیکر ملتے ہیں۔

پیکر محاکات نگاری کا کام بھی کرتے ہیں لیکن ان کا اصل منصب جذبات و تجربات کو محسوس اور معنی خیز بنانا ہے اس لیے ان کی تشکیل میں استعاروں سے زیادہ تر مدد لی جاتی ہے اس کے برخلاف محاکات نگاری کا تعلق حقیقت

نگاری سے ہے اور پیکر تراشی فن کے تاثراتی اور اظہاری دبستانوں سے موانست رکھتی ہے۔

ساحر کی شاعری میں محاکات کی بھی بعض عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ محاکات نگاری کا کمال جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں خارجی واقعات اور مظاہر کے علاوہ نفسی کیفیات کی تصویر کشی میں دکھائی دیتا ہے۔ ساحر کی محاکات نگاری زندگی کے وسیع مشاہدے، تجربے اور نفسیاتِ انسانی سے آگاہی کے علاوہ گہرے سماجی شعور کا بھی پتہ دیتی ہے اس کی تصدیق ذیل کی مثالوں سے ہوگی:

وہ اُجلے دریچوں میں پائل کی چھن چھن
تنفس کی اُلجھن پہ طبلے کی دھن دھن
یہ بے رُوح کمروں میں کھانسی کی ٹھن ٹھن
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں
یہ پھولوں کے گجرے یہ پیکوں کے چھینٹے
یہ بے باک نظریں، یہ گستاخ نقرے
یہ ڈھلکے بدن اور یہ مدقوق چہرے
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

——— چکلے

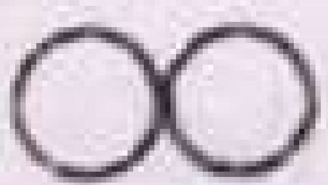
اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جواں
منہ میں سگرٹ لیے ہاتھوں میں برانڈی کے گلاس
جیب میں نقرئی سکوں کی کھنک

قہقہے مارتے ہنستے ہوئے استادہ ہیں
اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جواں

اسی ہوٹل کے قریب

بھوکے مجبور غلاموں کے گروہ
ٹکٹکی باندھ کے تکتے ہوئے اُوپر کی طرف
منتظر بیٹھے ہیں اس ساعتِ نایاب کے، جب
بُوٹ کی نوک سے نیچے پھینکے
اجنبی دیس کے بے فکر جوانوں کا گروہ
کوئی سکّہ کوئی سگرٹ کوئی کیک
یا ڈبل روٹی کے جھوٹے ٹکڑے
چھینا جھپٹی کے مناظر کا مزہ لینے کو
پالتو کُتّوں کے احساس پہ ہنس دینے کو

——— اَجنبی محافظ



پرتوِ خیال

شاعری کا انتخاب

تلخیاں
آؤ کہ کوئی خواب بنیں
پرچھائیاں
گاتا جائے بنجارہ

تلخیاں

ایک منظر

افق کے دریچے سے کرنوں نے جھانکا
فضا تن گئی راستے مسکرائے
سمٹنے لگی نرم کہرے کی چادر
جواں شاخساروں نے گھونگھٹ اٹھائے
پرندوں کی آواز سے کھیت چونکے
پُراسرار لَے میں رہٹ گنگنائے
حسیں شبنم آلود پگڈنڈیوں سے
لپٹنے لگے سبز پیڑوں کے سائے
وہ دُور ایک ٹیلے پہ آنچل سا جھلکا
تصور میں لاکھوں دیے جھلملائے

متاعِ غیر

میرے خوابوں کو جھروکوں کو سجانے والی!
تیرے خوابوں میں کہیں میرا گزر ہے کہ نہیں!
پوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتا دے مجھ کو
میری راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں

چار دن کی یہ رفاقت جو رفاقت بھی نہیں
عمر بھر کے لیے آزار ہوئی جاتی ہے
زندگی یوں تو ہمیشہ سے پریشان سی تھی
اب تو ہر سانس گراں بار ہوئی جاتی ہے

میری اُجڑی ہوئی نیندوں کے شبستانوں میں
تو کسی خواب کے پیکر کی طرح آئی ہے
کبھی اپنی سی کبھی غیر نظر آتی ہے
کبھی اخلاص کی مُورت کبھی ہرجائی ہے

پیار پر بس تو نہیں ہے مرا لیکن پھر بھی
تو بتا دے کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں
تو نے خود اپنے تبسم سے جگایا ہے جنھیں
اُن تمنّاؤں کا اظہار کروں یا نہ کروں

تو کسی اور کے دامن کی کلی ہے لیکن
میری راتیں تری خوشبو سے بسی رہتی ہیں
تو کہیں بھی ہو ترے پھول سے عارض کی قسم
تیری پلکیں، مری آنکھوں پہ جھکی رہتی ہیں

تیرے ہاتھوں کی حرارت، ترے سانسوں کی مہک
تیرتی رہتی ہے احساس کی پہنائی میں
ڈھونڈتی رہتی ہیں تخئیل کی باہیں تجھ کو
سرد راتوں کی سلگتی ہوئی تنہائی میں

تیرا الطاف و کرم ایک حقیقت ہے، مگر
یہ حقیقت بھی حقیقت میں فسانہ ہی نہ ہو
تیری مانوس نگاہوں کا یہ محتاط پیام
دل کے خوں کرنے کا اک اور بہانہ ہی نہ ہو

کون جانے مرے امروز کا فردا کیا ہے
قربتیں بڑھ کے پشیمان بھی ہو جاتی ہیں
دل کے دامن سے لپٹتی ہوئی رنگیں نظریں
دیکھتے دیکھتے انجان بھی ہو جاتی ہیں

خانہ آبادی

ایک دوست کی شادی پر

ترانے گونج اُٹھے ہیں فضا میں شادیانوں کے
ہوا ہے عطر آگیں ذرّہ ذرّہ مسکراتا ہے
مگر دُور، ایک افسُردہ مکاں میں سرد بستر پر
کوئی دل ہے کہ ہر آہٹ پہ یونہی چونک جاتا ہے
مِری آنکھوں میں آنسو آ گئے نادیدہ آنکھوں کے
مِرے دل میں کوئی غمگین نغمہ سرسراتا ہے
یہ رسمِ انقطاعِ عہدِ اُلفت یہ حیاتِ نَو
محبّت رو رہی ہے اور تمدّن مسکراتا ہے
یہ شادی خانہ آبادی ہو میرے محترم بھائی
"مبارک" کہہ نہیں سکتا مِرا دل کانپ جاتا ہے

شہکار

مصوّر! مَیں ترا شہکار واپس کرنے آیا ہوں
اب ان رنگین رخساروں میں تھوڑی زردیاں بھر دے
حجاب آلود نظروں میں ذرا بے باکیاں بھر دے
لبوں کی بھیگی بھیگی سلوٹوں کو مضمحل کر دے
نمایاں رنگِ پیشانی پہ عکسِ سوزِ دل کر دے
تبسّم آفریں چہرے میں کچھ سنجیدگی بھر دے
جواں سینے کی مخروطی اٹھانیں سرنگوں کر دے
گھنے بالوں کو کم کر دے مگر رخشندگی دے دے
نظر سے تمکنت لے کر مذاقِ عاجزی دے دے
مگر ہاں بنچ کے بدلے اسے صوفے پہ بٹھلا دے
یہاں، میری بجائے اک چمکتی کار دکھلا دے

نورجہاں کے مزار پر

پہلوئے شاہ میں یہ دخترِ جمہور کی قبر
کتنے گم گشتہ فسانوں کا پتہ دیتی ہے
کتنے خوں ریز حقائق سے اٹھاتی ہے نقاب
کتنی کچلی ہوئی جانوں کا پتہ دیتی ہے

کیسے مغرور شہنشاہوں کی تسکیں کے لیے
سالہا سال حسیناؤں کے بازار لگے
کیسے بہکی ہوئی نظروں کے تعیش کے لیے
سرخ محلوں میں جواں جسموں کے انبار لگے

کیسے ہر شاخ سے منہ بند مہکتی کلیاں
نوچ لی جاتی تھیں تزئینِ حرم کی خاطر
اور مرجھا کے بھی آزاد نہ ہو سکتی تھیں
ظلِّ سبحان کی الفت کے بھرم کی خاطر

کیسے اک فرد کے ہونٹوں کی ذرا سی جنبش
سرد کر سکتی تھی بے نوش وفاؤں کے چراغ
لوٹ سکتی تھی دمکتے ہوئے ماتھوں کا سہاگ
توڑ سکتی تھی مئے عشق سے لبریز ایاغ

سہمی سہمی سی فضاؤں میں یہ ویراں مرقد
اتنا خاموش ہے فریاد کناں ہو جیسے
سرد شاخوں میں ہوا چیخ رہی ہے ایسے
روحِ تقدیسِ و وفا مرثیہ خواں ہو جیسے

تو مری جان! مجھے حیرت و حسرت سے نہ دیکھ
ہم میں کوئی بھی جہاں نور و جہاں گیر نہیں
تو مجھے چھوڑ کے ٹھکرا کے بھی جا سکتی ہے
تیرے ہاتھوں میں مرے ہاتھ ہیں زنجیر نہیں

فن کار

مَیں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے
آج ان گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں

آج دُکان پہ نیلام اُٹھے گا اُن کا
تو نے جن گیتوں پہ رکھی تھی محبت کی اساس
آج چاندی کے ترازو میں تُلے گی ہر چیز
مرے افکار، مری شاعری میرا احساس

جو تری ذات سے منسوب تھے ان گیتوں کو
مفلسی، جنس بنانے پہ اتر آئی ہے
بھوک، تیرے رُخِ رنگیں کے فسانوں کے عوض
چند اشیائے ضرورت کی تمنائی ہے

دیکھ! اس کار گہِ محنت و سرمایہ میں
میرے نغمے بھی مرے پاس نہیں رہ سکتے
تیرے جلوے کسی زردار کی میراث سہی
تیرے خاکے بھی مِرے پاس نہیں رہ سکتے

آج ان گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں
مَیں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے

کبھی کبھی

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ زندگی تری زلفوں کی نرم چھاؤں میں
گزرنے پاتی تو شاداب ہو بھی سکتی تھی
یہ تیرگی جو مری زیست کا مقدر ہے
تری نظر کی شعاعوں میں کھو بھی سکتی تھی

عجب نہ تھا کہ میں بیگانۂ الم ہو کر
ترے جمال کی رعنائیوں میں کھو رہتا
ترا گداز بدن، تیری نیم باز آنکھیں
انہی حسین فسانوں میں محو ہو رہتا

پکاریں مجھے جب تلخیاں زمانے کی!
ترے لبوں سے حلاوت کے گھونٹ پی لیتا
حیات، چیختی پھرتی برہنہ سر، اور میں
گھنیری زلفوں کے سائے میں چھپ کے جی لیتا

مگر یہ ہو نہ سکا، اور اب یہ عالم ہے
کہ تو نہیں، ترا غم، تیری جستجو بھی نہیں
گزر رہی ہے کچھ اس طرح زندگی جیسے
اسے کسی کے سہارے کی آرزو بھی نہیں

زمانے بھر کے دکھوں کو لگا چکا ہوں گلے
گزر رہا ہوں کچھ انجانی رہ گزاروں سے
مہیب سائے مری سمت بڑھتے آتے ہیں
حیات و موت کے پرہول خارزاروں سے

نہ کوئی جادۂ منزل، نہ روشنی کا سراغ
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں زندگی میری
انھیں خلاؤں میں رہ جاؤں گا کبھی کھو کر
میں جانتا ہوں مری ہم نفس، مگر یونہی
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے

خوبصورت موڑ

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں
نہ میں تم سے کوئی اُمید رکھوں دل نوازی کی
نہ تم میری طرف دیکھو غلط انداز نظروں سے
نہ میرے دل کی دھڑکن لڑکھڑائے میری باتوں میں
نہ ظاہر ہو تمھاری کشمکش کا راز نظروں سے

تمھیں بھی کوئی اُلجھن روکتی ہے پیش قدمی سے
مجھے بھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ جلوے پرائے ہیں
مرے ہمراہ بھی رُسوائیاں ہیں میرے ماضی کی
تمھارے ساتھ بھی گزری ہوئی راتوں کے سائے ہیں

تعارف روگ ہو جائے تو اس کو بھولنا بہتر
تعلّق بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھّا
وہ افسانہ جسے تکمیل تک لانا نہ ہو ممکن
اسے اک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھّا
چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

غزل

دیکھا تو تھا یوں ہی کسی غفلت شعار نے
دیوانہ کر دیا دلِ بے اختیار نے

اے آرزو کے دھندلے خرابو جواب دو
پھر کس کی یاد آئی تھی مجھ کو پکارنے

تجھ کو خبر نہیں مگر اک سادہ لوح کو
برباد کر دیا ترے دو دن کے پیار نے

میں، اور تم سے ترکِ محبت کی آرزو
دیوانہ کر دیا ہے غمِ روزگار نے

اب اے دلِ تباہ ترا کیا خیال ہے
ہم تو چلے تھے کاکلِ گیتی سنوارنے

غزل

خودداریوں کے خون کو ارزاں نہ کر سکے
ہم اپنے جوہروں کو نمایاں نہ کر سکے

ہو کر خرابِ مے ترے غم تو بھلا دیے
لیکن غمِ حیات کا درماں نہ کر سکے

ٹوٹا طلسمِ عہدِ محبت کچھ اس طرح
پھر آرزو کی شمع فروزاں نہ کر سکے

ہر شے قریب آ کے کشش اپنی کھو گئی
وہ بھی علاجِ شوقِ گریزاں نہ کر سکے

کس درجہ دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے

مایوسیوں نے چھین لیے دل کے ولولے
وہ بھی نشاطِ روح کا ساماں نہ کر سکے

غزل

تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم

مایوسیِ مآلِ محبت نہ پوچھیے
اپنوں سے پیش آئے ہیں بیگانگی سے ہم

لو آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ اُمید
لو اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم

اُبھریں گے ایک بار ابھی دل کے ولولے
گو دب گئے ہیں بارِ غمِ زندگی سے ہم

گر زندگی میں مل گئے پھر اتفاق سے
پوچھیں گے اپنا حال تری بے بسی سے ہم

اللہ رے فریبِ مشیت کہ آج تک
دُنیا کے ظلم سہتے رہے خامشی سے ہم

تاج محل

تاج، تیرے لیے اک مظہرِ اُلفت ہی سہی
تجھ کو اس وادیِ رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب! کہیں اور مِلا کر مجھ سے

بزمِ شاہی میں غریبوں کا گذر کیا معنی؟
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوتِ شاہی کے نشاں
اس پہ اُلفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی

میری محبوب پسِ پردہ تشہیرِ وفا
تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا
مُردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا

ان گنت لوگوں نے دُنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے اُن کے
لیکن اُن کے لیے تشہیر کا سامان نہیں
کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے

یہ عمارات و مقابر، یہ فصیلیں یہ حصار!
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستوں
سینۂ دہر کے ناسور ہیں کہنہ ناسور
جذب ہے ان میں ترے اور مرے اجداد کا خوں!

میری محبوب! انھیں بھی تو محبت ہو گی!
جن کی صنّاعی نے بخشی ہے اسے شکلِ جمیل
اُن کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود
آج تک اُن پہ جلائی نہ کسی نے قندیل

یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارہ یہ محل
یہ منقش در و دیوار، یہ محراب یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق

میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے

چکلے

یہ کوچے یہ نیلام گھر دل کشی کے
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں، کہاں ہیں محافظ خودی کے
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

یہ پُر پیچ گلیاں یہ بے خواب بازار
یہ گمنام راہی، یہ سکّوں کی جھنکار
یہ عصمت کے سودے، یہ سودوں پہ تکرار
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

تعفّن سے پُر نیم روشن یہ گلیاں
یہ مسلی ہوئی ادھ کھلی زرد کلیاں
یہ بکتی ہوئی کھوکھلی رنگ رلیاں
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

وہ اُجلے دریچوں میں پائل کی چھن چھن
تنفّس کی الجھن پہ طبلے کی دھن دھن
یہ بے روح کمروں میں کھانسی کی ٹھن ٹھن
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

یہ گونجے ہوئے قہقہے راستوں پر
یہ چاروں طرف بھیڑ سی کھڑکیوں پر
یہ آوازے کھنچتے ہوئے آنچلوں پر
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

یہ پھولوں کے گجرے یہ پیکوں کے چھینٹے
یہ بے باک نظریں، یہ گستاخ فقرے
یہ ڈھلکے بدن اور یہ مدقوق چہرے
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

یہ بھوکی نگاہیں حسینوں کی جانب
یہ بڑھتے ہوئے ہاتھ سینوں کی جانب
لپکتے ہوئے پاؤں زینوں کی جانب
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

یہاں پیر بھی آ چکے ہیں، جواں بھی
تنو مند بیٹے بھی، ابا میاں بھی
یہ بیوی بھی ہے اور بہن بھی ہے ماں بھی
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی
پیمبر کی اُمت زلیخا کی بیٹی
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

بلاؤ خدایانِ دیں کو بلاؤ!
یہ کوچے، یہ گلیاں، یہ منظر دکھاؤ
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کو لاؤ
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

آؤ کہ کوئی خواب بُنیں

۲۶ جنوری

آؤ کہ آج غور کریں اس سوال پر
دیکھے تھے ہم نے جو، وہ حسیں خواب کیا ہوئے
دولت بڑھی تو ملک میں افلاس کیوں بڑھا
خوش حالیِ عوام کے اسباب کیا ہوئے
جو اپنے ساتھ ساتھ چلے کوئے دار تک
وہ دوست، وہ رفیق، وہ احباب کیا ہوئے
کیا مول لگ رہا ہے شہیدوں کے خون کا
مرتے تھے جن پہ ہم وہ سزا یاب کیا ہوئے

بے کس برہنگی کو کفن تک نہیں نصیب
وہ وعدہ ہائے اطلس و کمخواب کیا ہوئے
جمہوریت نواز، بشر دوست، امن خواہ
خود کو جو خود دیے تھے وہ القاب کیا ہوئے
مذہب کا روگ آج بھی کیوں لاعلاج ہے
وہ نسخہ ہائے نادر و نایاب کیا ہوئے
ہر کوچہ شعلہ زار ہے، ہر شہر قتل گاہ
یک جہتیِ حیات کے آداب کیا ہوئے
صحرائے تیرگی میں بھٹکتی ہے زندگی
اُبھرے تھے جو افق پہ وہ مہتاب کیا ہوئے
مُجرم ہوں میں اگر، تو گنہگار تم بھی ہو
اے رہبرانِ قوم خطاکار تم بھی ہو

جشنِ غالب

اکیس برس گزرے آزادیِ کامل کو!
تب جا کے کہیں ہم کو غالبؔ کا خیال آیا
تربت ہے کہاں اس کی مسکن تھا کہاں اُس کا
اب اپنے سخن پرور ذہنوں میں سوال آیا
سو سال سے جو تربت چادر کو ترستی تھی
اب اس پہ عقیدت کے پھولوں کی نمائش ہے
اُردو کے تعلق سے کچھ بھید نہیں کُھلتا
یہ جشن یہ ہنگامہ، خدمت ہے کہ سازش ہے
جن شہروں میں گونجی تھی غالبؔ کی نوا برسوں
اُن شہروں میں اب اُردو بے نام و نشاں ٹھہری

آزادیٔ کامل کا اعلان ہوا جس دن
معتوب زباں ٹھہری، غدّار زباں ٹھہری
جس عہدِ سیاست نے یہ زندہ زباں کچلی
اُس عہدِ سیاست کو مرحوموں کا غم کیوں ہے
غالب جسے کہتے ہیں اُردو ہی کا شاعر تھا
اُردو پہ ستم ڈھا کر غالب پہ کرم کیوں ہے
یہ جشن یہ ہنگامے دلچسپ کھلونے ہیں
کچھ لوگوں کی کوشش ہے کچھ لوگ بہل جائیں
جو وعدۂ فردا پر اب مل نہیں سکتے ہیں
ممکن ہے کہ کچھ عرصہ اس جشن پہ ٹل جائیں
یہ جشن مبارک ہو، پر یہ بھی صداقت ہے
ہم لوگ حقیقت کے احساس سے عاری ہیں
گاندھی ہو کہ غالب ہو انصاف کی نظروں میں
ہم دونوں کے قاتل ہیں، دونوں کے پجاری ہیں

اے شریف انسانو

ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کے پس منظر میں لکھی گئی اور معاہدۂ تاشقند کی سالگرہ پر نشر کی گئی۔

۱

خون اپنا ہو یا پرایا ہو
نسلِ آدم کا خون ہے آخر
جنگ مشرق میں ہو، کہ مغرب میں
امنِ عالم کا خون ہے آخر

بم گھروں پر گریں، کہ سرحد پر
رُوحِ تعمیر زخم کھاتی ہے
کھیت اپنے جلیں کہ اوروں کے
زیست فاقوں سے تلملاتی ہے

ٹینک آگے بڑھیں کہ پیچھے ہٹیں
کوکھ دھرتی کی بانجھ ہوتی ہے
فتح کا جشن ہو کہ ہار کا سوگ
زندگی میتوں پہ روتی ہے

جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
آگ اور خون آج بخشے گی
بھوک اور احتیاج کل دے گی

اس لیے اے شریف انسانو!
جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے
آپ اور ہم سبھی کے آنگن میں
شمع جلتی رہے تو بہتر ہے

۲

برتری کے ثبوت کی خاطر
خوں بہانا ہی کیا ضروری ہے
گھر کی تاریکیاں مٹانے کو
گھر جلانا ہی کیا ضروری ہے

جنگ کے اور بھی تو میداں ہیں
صرف میدانِ کشت و خوں ہی نہیں

حاصلِ زندگی خرد بھی ہے
حاصلِ زندگی جنوں ہی نہیں

آؤ اس تیرہ بخت دُنیا میں
فکر کی روشنی کو عام کریں
امن کو جن سے تقویت پہنچے
ایسی جنگوں کا اہتمام کریں

جنگ، وحشت سے، بربریت سے
امن، تہذیب وارتقا کے لیے
جنگ، مرگ آفریں سیاست سے
امن، انسان کی بقا کے لیے

جنگ، افلاس اور غلامی سے
امن، بہتر نظام کی خاطر
جنگ بھٹکی ہوئی قیادت سے
امن بے بس عوام کی خاطر

جنگ، سرمائے کے تسلّط سے
امن، جمہور کی خوشی کے لیے
جنگ، جنگوں کے فلسفے کے خلاف
امن، پُرامن زندگی کے لیے

میں زندہ ہوں

مَیں زندہ ہوں یہ مشتہر کیجیے
مرے قاتلوں کو خبر کیجیے
زمیں سخت ہے، آسماں دُور ہے،
بسر ہو سکے تو بسر کیجیے
ستم کے بہت سے ہیں ردِّ عمل
ضروری نہیں چشم تر کیجیے
وہی ظلم بارِ دگر ہے تو پھر
وہی جُرم بارِ دگر کیجیے
قفس توڑنا بعد کی بات ہے
ابھی خواہشِ بال و پر کیجیے

دیکھا ہے زندگی کو

دیکھا ہے زندگی کو کچھ اتنا قریب سے
چہرے تمام لگنے لگے ہیں عجیب سے

اے روحِ عصر جاگ، کہاں سو رہی ہے تُو
آواز دے رہے ہیں پیمبر صلیب سے

اِس رینگتی حیات کا کب تک اُٹھائیں بار
بیمار اب اُلجھنے لگے ہیں طبیب سے

ہر گام پر ہے مجمعِ عشّاق منتظر!
مقتل کی راہ ملتی ہے کوئے حبیب سے

اس طرح زندگی نے دیا ہے ہمارا ساتھ
جیسے کوئی نباہ رہا ہو رقیب سے

صدیوں سے

صدیوں سے انسان یہ سنتا آیا ہے
دُکھ کی دھوپ کے آگے سُکھ کا سایا ہے
ہم کو ان سستی خوشیوں کا لوبھ نہ دو
ہم نے سوچ سمجھ کر غم اپنایا ہے
جھوٹ تو قاتل ٹھہرا، اس کا کیا رونا
سچ نے بھی انساں کا خوں بہایا ہے
پیدائش کے دن سے موت کی زد میں ہیں
اس مقتل میں کون ہمیں لے آیا ہے
اوّل اوّل جس دل نے برباد کیا
آخر آخر وہ دل ہی کام آیا ہے
اُتنے دن احسان کیا دیوانوں پر
جتنے دن لوگوں نے ساتھ نبھایا ہے

نَے میں کچھ نہیں

نغمہ جو ہے تو رُوح میں ہے، نَے میں کچھ نہیں
گر تجھ میں کچھ نہیں، تو کسی شے میں کچھ نہیں
تیرے لہُو کی آنچ سے گرمی ہے جسم کی!
مَے کے ہزار وصف سہی، مَے میں کچھ نہیں
جس میں خلوصِ فکر نہ ہو، وہ سخن فضول
جس میں نہ دل شریک ہو، اُس لَے میں کچھ نہیں
کشکولِ فن اُٹھا کے سُوئے خسرواں نہ جا
اب دستِ اختیارِ جم و کَے میں کچھ نہیں

دِل اَبھی ـــــــ!

زندگی سے اُنس ہے
حُسن سے لگاؤ ہے
دھڑکنوں میں آج بھی
عشق کا الاؤ ہے
دل ابھی بُجھا نہیں

رنگ بھر رہا ہوں میں
خاکۂ حیات میں
آج بھی ہوں منہمک
فکرِ کائنات میں
غم ابھی لُٹا نہیں

حرفِ حق عزیز ہے
ظلم ناگوار ہے
عہدِ نو سے آج بھی
عہد، اُستوار ہے
مَیں ابھی مرا نہیں

آؤ کہ کوئی خواب بُنیں

آؤ کہ کوئی خواب بُنیں، کل کے واسطے
ورنہ یہ رات، آج کے سنگین دَور کی
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے، اکہ جان و دل
تا عُمر پھر نہ کوئی حسیں خواب بُن سکیں

گو ہم سے بھاگتی رہی یہ تیز گام عُمر
خوابوں کے آسرے پہ کٹی ہے تمام عُمر

زلفوں کے خواب، ہونٹوں کے خواب اور بدن کے خواب
معراجِ فن کے خواب، کمالِ سخن کے خواب
تہذیبِ زندگی کے، فروغِ وطن کے خواب
زنداں کے خواب، کوچۂ دار و رسن کے خواب

یہ خواب ہی تو اپنی جوانی کے پاس تھے
یہ خواب ہی تو اپنے عمل کی اساس تھے
یہ خواب، مر گئے ہیں تو بے رنگ ہے حیات
یوں ہے کہ جیسے دستِ تہِ سنگ ہے حیات

آؤ کہ کوئی خواب بُنیں، کل کے واسطے
ورنہ یہ رات آج کے سنگین دَور کی،
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے کہ جان و دل
تا عمر پھر نہ کوئی حسیں خواب بُن سکیں

نادار تک نہیں پہنچا

فن جو نادار تک نہیں پہنچا
ابھی معیار تک نہیں پہنچا
اس نے بروقت بے رُخی برتی
شوق، آزار تک نہیں پہنچا
عکسِ مے ہو، کہ جلوۂ گُل ہو
رنگِ رخسار تک نہیں پہنچا

حرفِ انکار سر بلند رہا
ضعفِ اقرار تک نہیں پہنچا
حکمِ سرکار کی پہنچ مت پوچھ
اہلِ سرکار تک نہیں پہنچا
عدل گاہیں تو دُور کی شے ہیں
قتل اخبار تک نہیں پہنچا
انقلاباتِ دہر کی بنیاد
حق، جو حقدار تک نہیں پہنچا
وہ مسیحا نفس نہیں جس کا
سلسلہ دار تک نہیں پہنچا

اے نئی نسل

(گورنمنٹ کالج لدھیانہ، کے جشنِ گولڈن جُبلی پر لکھی گئی۔

میرے اجداد کا وطن، یہ شہر
میری تعلیم کا جہاں یہ مقام
میرے بچپن کی دوست، یہ گلیاں
جن میں رُسوا ہوا شباب کا نام
یاد آتے ہیں ان فضاؤں میں
کتنے نزدیک اور دُور کے نام
کتنے خوابوں کے ملگجے چہرے
کتنی یادوں کے مرمریں اجسام
کتنے ہنگامے، کتنی تحریکیں
کتنے نعرے جو تھے زبان زدِ عام

میں یہاں جب شعور کو پہنچا
اجنبی قوم کی تھی قوم غلام
یونین جیک درس گاہ پہ تھا
اور وطن میں تھا سامراجی نظام

اسی مٹی کو ہاتھ میں لے کر!
ہم بنے تھے بغاوتوں کے امام
یہیں جانچے تھے دھرم کے وشواس
یہیں پرکھے تھے دین کے اوہام
یہیں منکر بنے روایت کے
یہیں توڑے رواج کے اصنام
یہیں نکھرا تھا ذوقِ نغمہ گری
یہیں اُترا تھا شعر کا الہام
میں جہاں بھی رہا یہیں کا رہا
مجھ کو بھولے نہیں ہیں یہ درو بام
نام میرا جہاں جہاں پہنچا
ساتھ پہنچا ہے اس دیار کا نام
میں یہاں میزباں بھی، مہماں بھی
آپ جو چاہیں دیجیے مجھے نام
نذر کرتا ہوں ان فضاؤں کو
اپنا دل، اپنی رُوح، اپنا کلام
اور فیضانِ علم جاری ہو
اور اُونچا ہو اس دیار کا نام
اور شاداب ہو یہ ارضِ حسیں
اور مہکے یہ وادیِ گلفام
اور اُبھریں صنم گری کے نقوش
اور چھلکیں مئے سخن کے جام

اور نکلیں وہ بے نوا، جن کو!
اپنا سب کچھ کہیں وطن کے عوام!
قافلے آتے جاتے رہتے ہیں
کب ہوا ہے یہاں کسی کا قیام
نسل در نسل کام جاری ہے
کارِ دنیا کبھی ہوا نہ تمام!
کل جہاں میں تھا، آج تُو ہے وہاں
اے نئی نسل! تجھ کو میرا سلام!

پرچھائیاں

ایک طویل نظم

جوان رات کے سینے پہ دودھیا آنچل
مچل رہا ہے کسی خوابِ مرمریں کی طرح
حسین پھول، حسیں پتّیاں، حسیں شاخیں
لچک رہی ہیں کسی جسمِ نازنیں کی طرح!
فضا میں گھل سے گئے ہیں افق کے نرم خطوط
زمیں حسین ہے خوابوں کی سرزمیں کی طرح
تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں
کبھی گمان کی صورت، کبھی یقیں کی طرح

وہ پیڑ جن کے تلے ہم پناہ لیتے تھے
کھڑے ہیں آج بھی ساکت کسی امیں کی طرح

انھیں کے سائے میں پھر آج دو دھڑکتے دل
خموش ہونٹوں سے کچھ کہنے سننے آئے ہیں
نہ جانے کتنی کشاکش سے کتنی کاوش سے
یہ سوتے جاگتے لمحے چُرا کے لائے ہیں

یہی فضا تھی، یہی رُت، یہی زمانہ تھا
یہیں سے ہم نے محبت کی ابتدا کی تھی
دھڑکتے دل سے لرزتی ہوئی نگاہوں سے
حضورِ غیب میں ننھی سی التجا کی تھی
کہ آرزو کے کنول کھِل کے پھول ہو جائیں
دل و نظر کی دعائیں قبول ہو جائیں
تصورات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

تم آ رہی ہو زمانے کی آنکھ سے بچ کر
نظر جھکائے ہوئے اور بدن چرائے ہوئے
خود اپنے قدموں کی آہٹ سے جھینپتی ڈرتی
خود اپنے سائے کی جنبش سے خوف کھائے ہوئے

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

رواں ہے چھوٹی سی کشتی ہواؤں کے رُخ پر
ندی کے ساز پہ ملّاح گیت گاتا ہے
تمھارا جسم ہر اک لہر کے جھکولے سے
مری کھُلی ہوئی بانہوں میں جھول جاتا ہے

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

میں پھُول ٹانک رہا ہوں تمھارے جوڑے میں
تمھاری آنکھ مسرّت سے جھکتی جاتی ہے
نہ جانے آج میں کیا بات کہنے والا ہوں
زبان خشک ہے، آواز رُکتی جاتی ہے

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

مرے گلے میں تمھاری گداز بانہیں ہیں
تمھارے ہونٹوں پہ میرے لبوں کے سائے ہیں
مجھے یقین کہ ہم اب کبھی نہ بچھڑیں گے
تمھیں گمان کہ ہم مِل کے بھی پرائے ہیں

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

مرے پلنگ پہ بکھری ہوئی کتابوں کو
ادائے عجز و کرم سے اُٹھا رہی ہو تم
سہاگ رات جو ڈھولک پہ گائے جاتے ہیں
دبے سُروں میں وہی گیت گا رہی ہو تم

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

وہ لمحے کتنے دلکش تھے، وہ گھڑیاں کتنی پیاری تھیں
وہ سہرے کتنے نازک تھے وہ لڑیاں کتنی پیاری تھیں
بستی کی ہر اک شاداب گلی، خوابوں کا جزیرہ تھی گویا
ہر موجِ نفس، ہر موجِ صبا نغموں کا ذخیرہ تھی گویا

ناگاہ لہکتے کھیتوں سے ٹاپوں کی صدائیں آنے لگیں
بارود کی بوجھل بو لے کر پچھم سے ہوائیں آنے لگیں
تعمیر کے روشن چہرے پر تخریب کا بادل پھیل گیا
ہر گاؤں میں وحشت ناچ اُٹھی ہر شہر میں جنگل پھیل گیا

مغرب کے مہذب ملکوں سے کچھ خاکی وردی پوش آئے
اٹھلاتے ہوئے مغرور آئے لہراتے ہوئے مدہوش آئے
خاموش زمیں کے سینے میں خیموں کی طنابیں گڑنے لگیں
مکھن سی ملائم راہوں پر بوٹوں کی خراشیں پڑنے لگیں

نوجوں کے بھیانک بینڈ تلے چرخوں کی صدائیں ڈوب گئیں
جیپوں کی سُلگتی دُھول تلے، پھولوں کی قبائیں ڈوب گئیں

انسان کی قیمت گرنے لگی، اجناس کے بھاؤ چڑھنے لگے
چوپال کی رونق گھٹنے لگی، بھرتی کے دفاتر بڑھنے لگے

بستی کے سجیلے شوخ جواں، بن بن کے سپاہی جانے لگے
جس راہ سے کم ہی لوٹ سکے، اس راہ پہ راہی جانے لگے
ان جانے والے دستوں میں غیرت بھی گئی برنائی بھی
ماؤں کے جواں بیٹے بھی گئے، بہنوں کے چہیتے بھائی بھی

بستی پہ اُداسی چھانے لگی، میلوں کی بہاریں ختم ہوئیں
آموں کی لچکتی شاخوں سے جھولوں کی قطاریں ختم ہوئیں
دھول اُڑنے لگی بازاروں میں بھوک اُگنے لگی کھلیانوں میں
ہر چیز دکانوں سے اٹھ کر، روپوش ہوئی تہہ خانوں میں
بدحال گھروں کی بدحالی، بڑھتے بڑھتے جنجال بنی
مہنگائی بڑھ کر کال بنی، ساری بستی کنگال بنی
چرواہیاں رستہ بھول گئیں، پنہاریاں پنگھٹ چھوڑ گئیں
کتنی ہی کنواری ابلائیں، ماں باپ کی چوکھٹ چھوڑ گئیں

افلاس زدہ دہقانوں کے ہل بیل بکے، کھلیان بکے
جینے کی تمنّا کے ہاتھوں، جینے ہی کے سب سامان بکے

کچھ بھی نہ رہا جب بکنے کو، جسموں کی تجارت ہونے لگی
خلوت میں بھی جو ممنوع تھی، وہ جلوت میں جسارت ہونے لگی

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں
تم آ رہی ہو سرِ عام بال بکھرائے
ہزار گونہ ملامت کا بار اُٹھائے ہوئے
ہوس پرست نگاہوں کی چیرہ دستی سے
بدن کی جھینپتی عُریانیاں چھپائے ہوئے

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

میں شہر جا کے ہر اک در پہ جھانک آیا ہوں
کسی جگہ مری محنت کا مول مل نہ سکا
ستم گروں کے سیاسی قمار خانے میں
الم نصیب فراست کا مول مل نہ سکا

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

تمھارے گھر میں قیامت کا شور برپا ہے
محاذِ جنگ سے ہرکارہ "تار" لایا ہے

کہ جس کا ذکر تمھیں زندگی سے پیارا تھا
وہ بھائی "نرغۂ دشمن" میں کام آیا ہے

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

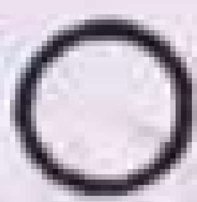
ہر ایک گام پہ بدنامیوں کا جمگھٹ ہے
ہر ایک موڑ پہ رسوائیوں کے میلے ہیں
نہ دوستی، نہ تکلّف، نہ دلبری، نہ خلوص
کسی کا کوئی نہیں، آج سب اکیلے ہیں

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

وہ رہ گزر جو مرے دل کی طرح سُونی ہے
نہ جانے تم کو کہاں لے کے جانے والی ہے
تمھیں خرید رہے ہیں ضمیر کے قاتل
افق پہ خونِ تمنّائے دل کی لالی ہے

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام ہے اب تک یاد مجھے
چاہت کے سنہرے خوابوں کا انجام ہے اب تک یاد مجھے
اُس شام مجھے معلوم ہُوا کھلیتوں کی طرح اس دُنیا میں
سہمی ہوئی دوشیزاؤں کی مسکان بھی بیچی جاتی ہے
اُس شام مجھے معلوم ہُوا، اس کارگہہِ زرداری میں
دو بھولی بھالی رُوحوں کی پہچان بھی بیچی جاتی ہے
اُس شام مجھے معلوم ہوا، جب باپ کی کھیتی چھن جائے
ممتا کے سنہرے خوابوں کی انمول نشانی بکتی ہے
اُس شام مجھے معلوم ہوا، جب بھائی جنگ میں کام آئیں
سرمائے کے قحبہ خانے میں بہنوں کی جوانی بکتی ہے
سُورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام ہے اب تک یاد مجھے
چاہت کے سنہرے خوابوں کا انجام ہے اب تک یاد مجھے



تم آج ہزاروں میل یہاں سے دُور کہیں تنہائی میں
یا بزمِ طرب آرائی میں
میرے سپنے بُنتی ہوگی، بیٹھی آغوشِ پرائی میں

اور میں سینے میں غم لے کر دن رات مشقت کرتا ہوں

جینے کی خاطر مرتا ہوں
اپنے فن کو رسوا کر کے اغیار کا دامن بھرتا ہوں

مجبور ہوں میں، مجبور ہو تم، مجبور یہ دنیا ساری ہے
تن کا دکھ من پر بھاری ہے
اِس دور میں جینے کی قیمت یا دار و رسن یا خواری ہے

میں دار و رسن تک جا نہ سکا تم جہد کی حد تک آ نہ سکیں
چاہا تو مگر اپنا نہ سکیں
ہم تم دو ایسی روحیں ہیں جو منزلِ تسکیں پا نہ سکیں

جینے کو جیے جاتے ہیں مگر سانسوں میں چتائیں جلتی ہیں
خاموش وفائیں جلتی ہیں
سنگین حقائق زاروں میں خوابوں کی ردائیں جلتی ہیں

اور آج جب ان پیڑوں کے تلے پھر دو سائے لہرائے ہیں
پھر دو دل ملنے آئے ہیں
پھر موت کی آندھی اٹھی ہے پھر جنگ کے بادل چھائے ہیں

میں سوچ رہا ہوں ان کا بھی اپنی ہی طرح انجام نہ ہو
ان کا بھی جنوں ناکام نہ ہو
ان کے بھی مقدر میں لکھی، اک خون میں لتھڑی شام نہ ہو
سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام ہے اب تک یاد مجھے

چاہت کے سنہرے خوابوں کا انجام ہے اب تک یاد مجھے

ہمارا پیار حوادث کی تاب لا نہ سکا
مگر انھیں تو مرادوں کی رات مِل جائے
ہمیں تو کشمکشِ مرگِ بے اماں ہی ملی
انھیں تو جھومتی گاتی حیات مِل جائے

بہت دنوں سے ہے یہ مشغلہ سیاست کا
کہ جب جوان ہوں بچّے تو قتل ہو جائیں
بہت دنوں سے ہے یہ خبط حکمرانوں کو
کہ دور دور کے ملکوں میں قحط بو جائیں

بہت دنوں سے جوانی کے خواب ویراں ہیں
بہت دنوں سے محبت پناہ ڈھونڈتی ہے
بہت دنوں سے ستم دیدہ شاہراہوں میں
نگارِ زیست کی عصمت پناہ ڈھونڈتی ہے

چلو کہ آج سبھی پائمال روحوں سے
کہیں کہ اپنے ہر اک زخم کو زباں کر لیں
ہمارا راز، ہمارا نہیں سبھی کا ہے
چلو کہ سارے زمانے کو راز داں کر لیں

چلو کہ چل کے سیاسی مقامروں سے کہیں

کہ ہم کو جنگ و جدل کے چلن سے نفرت ہے

جسے لہو کے سوا کوئی رنگ راس نہ آئے
ہمیں حیات کے اُس پیرہن سے نفرت ہے

کہو کہ اب کوئی قاتل اگر ادھر آیا
تو ہر قدم پہ زمیں تنگ ہوتی جائے گی
ہر ایک موجِ ہوا رُخ بدل کے جھپٹے گی
ہر ایک شاخ رگِ سنگ ہوتی جائے گی

اُٹھو کہ آج ہر اک جنگجو سے یہ کہہ دیں
کہ ہم کو کام کی خاطر کلوں کی حاجت ہے
ہمیں کسی کی زمیں چھیننے کا شوق نہیں
ہمیں تو اپنی زمیں پر ہلوں کی حاجت ہے

کہو کہ اب کوئی تاجر ادھر کا رُخ نہ کرے
اب اس جگہ کوئی کنواری نہ بیچی جائے گی
یہ کھیت جاگ پڑے اُٹھ کھڑی ہوئی فصلیں
اب اس جگہ کوئی کیاری نہ بیچی جائے گی

یہ سرزمین ہے گوتم کی اور نانک کی
اس ارضِ پاک پہ وحشی نہ چل سکیں گے کبھی
ہمارا خون امانت ہے نسلِ نو کے لیے
ہمارے خون پہ لشکر نہ پل سکیں گے کبھی

کہو کہ آج بھی ہم سب اگر خموش رہے
تو اس دمکتے ہوئے خاکداں کی خیر نہیں
جُنوں کی ڈھالی ہوئی ایٹمی بلاؤں سے
زمیں کی خیر نہیں، آسماں کی خیر نہیں

گزشتہ جنگ میں گھر ہی جلے، مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گزشتہ جنگ میں پیکر جلے، مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

تصورات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں

گاتا جائے بنجارہ

فلمی نغمے



اشکوں میں جو پایا ہے وہ گیتوں میں دیا ہے
اس پر بھی سُنا ہے کہ زمانے کو گلا ہے
جو تار سے نکلی ہے وہ دُھن سب نے سُنی ہے
جو ساز پہ گزری ہے وہ کس دل کو پتہ ہے
ہم پھول ہیں اوروں کے لیے لائے ہیں خوشبو
اپنے لیے لے دے کے بس اک داغ ملا ہے

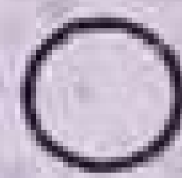


مَیں نے چاند اور ستاروں کی تمنّا کی تھی
مجھ کو راتوں کی سیاہی کے سوا کچھ نہ مِلا
مَیں وہ نغمہ ہوں جسے پیار کی محفل نہ ملی
وہ مسافر ہوں جسے کوئی بھی منزل نہ ملی
زخم پائے ہیں بہاروں کی تمنّا کی تھی
مَیں نے چاند اور ستاروں کی تمنّا کی تھی
کسی گیسو، کسی آنچل کا سہارا بھی نہیں
راستے میں کوئی دھندلا سا ستارہ بھی نہیں
میری نظروں نے نظاروں کی تمنّا کی تھی
مَیں نے چاند اور ستاروں کی تمنّا کی تھی
دل میں ناکام اُمیدوں کے بسیرے پائے
روشنی لینے کو نکلا تو اندھیرے پائے
رنگ اور نور کے دھاروں کی تمنّا کی تھی
مَیں نے چاند اور ستاروں کی تمنّا کی تھی

(۲)

مَیں نے چاند اور ستاروں کی تمنّا کی تھی
مجھ کو راتوں کی سیاہی کے سوا کچھ نہ ملا
میری راہوں سے جدا ہو گئیں راہیں ان کی
آج بدلی نظر آتی ہیں نگاہیں ان کی
جن سے اس دل نے سہاروں کی تمنّا کی تھی
مَیں نے چاند اور ستاروں کی تمنّا کی تھی
پیار مانگا تو سسکتے ہوئے ارمان ملے
چَین چاہا تو اُمڈتے ہوئے طوفان ملے
ڈوبتے دل نے کناروں کی تمنّا کی تھی
مَیں نے چاند اور ستاروں کی تمنّا کی تھی

اب وہ کرم کریں کہ ستم، مَیں نشے میں ہُوں
مجھ کو نہ کوئی ہوش نہ غم، مَیں نشے میں ہُوں
سینے سے بوجھ ان کے غموں کا اُتار کے
آیا ہوں آج اپنی جوانی کو ہار کے
کہتے ہیں ڈگمگاتے قدم، مَیں نشے میں ہُوں
وہ بے وفا ہیں اب بھی یہ دل مانتا نہیں
کم بخت ناسمجھ ہے انھیں جانتا نہیں
مَیں آج توڑ دوں گا بھرم مَیں نشے میں ہوں
فرصت نہیں ہے رونے رُلانے کے واسطے
آئے نہ اُن کی یاد ستانے کے واسطے
اس وقت دل کا درد ہے کم، مَیں نشے میں ہوں



ساتھی ہاتھ بڑھانا

ایک اکیلا تھک جائے گا مل کر بوجھ اُٹھانا
ساتھی ہاتھ بڑھانا

ہم محنت والوں نے جب بھی مل کر قدم بڑھایا
ساگر نے رستہ چھوڑا پربت نے سیس جھکایا
فولادی ہیں سینے اپنے فولادی ہیں باہیں
ہم چاہیں تو پیدا کر دیں چٹانوں میں راہیں
ساتھی ہاتھ بڑھانا

محنت اپنی لیکھ کی ریکھا، محنت سے کیا ڈرنا
کل غیروں کی خاطر کی آج اپنی خاطر کرنا
اپنا دُکھ بھی ایک ہے ساتھی اپنا سُکھ بھی ایک
اپنی منزل سچ کی منزل، اپنا رستہ نیک
ساتھی ہاتھ بڑھانا

ایک سے ایک ملے تو قطرہ بن جاتا ہے دریا
ایک سے ایک ملے تو ذرّہ بن جاتا ہے صحرا
ایک سے ایک ملے تو رائی بن سکتی ہے پربت
ایک سے ایک ملے تو انساں بس میں کر لے قسمت

ساتھی ہاتھ بڑھانا

ماٹی سے ہم لعل نکالیں موتی لائیں جل سے
جو کچھ اس دُنیا میں بنا ہے بنا ہمارے بَل سے
کب تک محنت کے پیروں میں دولت کی زنجیریں
ہاتھ بڑھا کر چھین لو اپنے خوابوں کی تعبیریں

ساتھی ہاتھ بڑھانا

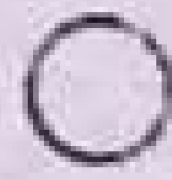


جانے وہ کیسے لوگ تھے جن کے پیار کو پیار ملا
ہم نے تو جب کلیاں مانگیں کانٹوں کا ہار ملا
خوشیوں کی منزل ڈھونڈی تو غم کی گرد ملی
چاہت کے نغمے چاہے تو آہِ سرد ملی
دل کے بوجھ کو دونا کر گیا جو غم خوار ملا
بچھڑ گیا ہر ساتھی دے کر پل دو پل کا ساتھ
کس کو فرصت ہے جو تھامے دیوانوں کا ہاتھ
ہم کو اپنا سایہ تک اکثر بیزار ملا
اس کو ہی جینا کہتے ہیں تو یوں ہی جی لیں گے
اُف نہ کریں گے، لب سی لیں گے آنسو پی لیں گے
غم سے اب گھبرانا کیسا، غم سو بار ملا!



عورت نے جنم دیا مردوں کو مردوں نے اُسے بازار دیا
جب جی چاہا مسلا کچلا، جب جی چاہا دھتکار دیا
تُلتی ہے کہیں دیناروں میں، بکتی ہے کہیں بازاروں میں
ننگی نچوائی جاتی ہے، عیاشوں کے درباروں میں
یہ وہ بے عزت چیز ہے جو بٹ جاتی ہے عزت داروں میں
عورت نے جنم دیا مردوں کو مردوں نے اُسے بازار دیا
مردوں کے لیے ہر ظلم روا، عورت کے لیے رونا بھی خطا
مردوں کے لیے لاکھوں سیجیں عورت کے لیے بس ایک چتا
مردوں کے لیے ہر عیش کا حق، عورت کے لیے جینا بھی سزا
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اُسے بازار دیا
جن سینوں نے اُن کو دودھ دیا، اُن سینوں کا بیوپار کیا
جس کوکھ میں ان کا جسم ڈھلا، اُس کوکھ کا کاروبار کیا
جس تن سے اُگے کونپل بن کر، اُس تن کو ذلیل و خوار کیا
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اُسے بازار دیا

مردوں نے بنائیں جو رسمیں ان کو حق کا فرمان کہا
عورت کے زندہ جلنے کو، قربانی اور بلیدان کہا
عصمت کے بدلے روٹی دی اور اس کو بھی احسان کہا
عورت نے جنم دیا مردوں کو مردوں نے اسے بازار دیا
سنسار کی ہر اک بے شرمی، غربت کی گود میں پلتی ہے
چکلوں ہی میں آکر رکتی ہے، فاقوں سے جو راہ نکلتی ہے
مردوں کی ہوس ہے جو اکثر، عورت کے پاپ میں ڈھلتی ہے
عورت نے جنم دیا مردوں کو مردوں نے اسے بازار دیا
عورت سنسار کی قسمت ہے، پھر بھی تقدیر کی ہیٹی ہے
اوتار، پیمبر جنتی ہے، پھر بھی شیطان کی بیٹی ہے
یہ وہ بد قسمت ماں ہے جو بیٹوں کی سیج پہ لیٹی ہے
عورت نے جنم دیا مردوں کو مردوں نے اسے بازار دیا



وہ صبح کبھی تو آئے گی

ان کالی صدیوں کے سر سے جب رات کا آنچل ڈھلکے گا
جب دُکھ کے بادل پگھلیں گے، جب سُکھ کا ساگر چھلکے گا
جب امبر جھوم کے ناچے گا، جب دھرتی نغمے گائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

جس صبح کی خاطر جُگ جُگ سے ہم سب مر مر کر جیتے ہیں!
جس صبح کے امرت کی دُھن میں ہم زہر کے پیالے پیتے ہیں
اِن بھوکی پیاسی روحوں پر اک دن تو کرم فرمائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

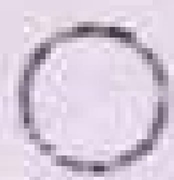
مانا کہ ابھی تیرے میرے ارمانوں کی قیمت کچھ بھی نہیں
مٹّی کا بھی ہے کچھ مول مگر انسانوں کی قیمت کچھ بھی نہیں
انسانوں کی عزت جب جھوٹے سکّوں میں نہ تولی جائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

دولت کے لیے جب عورت کی عصمت کو نہ بیچا جائے گا
چاہت کو نہ کچلا جائے گا، غیرت کو نہ بیچا جائے گا
اپنے کالے کرتوتوں پر جب یہ دُنیا شرمائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

بیتیں گے کبھی تو دن آخر یہ بھوک کے اور بیکاری کے
ٹوٹیں گے کبھی تو بُت آخر دولت کی اجارہ داری کے
جب ایک انوکھی دُنیا کی بنیاد اُٹھائی جائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

مجبور بُڑھاپا جب سُونی راہوں کی دُھول نہ پھانکے گا
معصوم لڑکپن جب گندی گلیوں میں بھیک نہ مانگے گا
حق مانگنے والوں کو جس دن سُولی نہ دکھائی جائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

فاقوں کی چِتاؤں پر جس دن انساں نہ جلائے جائیں گے
سینے کے دہکتے دوزخ میں ارماں نہ جلائے جائیں گے
یہ نرک سے بھی گندی دُنیا، جب سورگ بنائی جائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی



وہ صبح ہمیں سے آئے گی

جب دھرتی کروٹ بدلے گی، جب قید سے قیدی چھوٹیں گے
جب پاپ گھروندے پھوٹیں گے، جب ظلم کے بندھن ٹوٹیں گے
اُس صبح کو ہم ہی لائیں گے، وہ صبح ہمیں سے آئے گی
وہ صبح ہمیں سے آئے گی

منحوس سماجی ڈھانچوں میں جب ظلم نہ پالے جائیں گے
جب ہاتھ نہ کاٹے جائیں گے، جب سر نہ اُچھالے جائیں گے
جیلوں کے بنا جب دُنیا کی سرکار چلائی جائے گی
وہ صبح ہمیں سے آئے گی

سنسار کے سارے محنت کش کھیتوں سے مِلوں سے نکلیں گے
بے گھر بے در بے بس انساں تاریک بِلوں سے نکلیں گے
دُنیا امن اور خُوش حالی کے پھُولوں سے سجائی جائے گی
وہ صبح ہمیں سے آئے گی



کون آیا کہ نگاہوں میں چمک جاگ اُٹھی
دل کے سوئے ہوئے تاروں میں کھنک جاگ اُٹھی
کس کے آنے کی خبر لے کے ہوائیں آئیں
جسم سے پھول چٹکنے کی صدائیں آئیں
رُوح کھلنے لگی سانسوں کی مہک جاگ اُٹھی
کس نے یہ میری طرف دیکھ کے باہیں کھولیں
شوخ جذبات نے سینے میں نگاہیں کھولیں
ہونٹ تپنے لگے، زلفوں میں لچک جاگ اُٹھی
کس کے ہاتھوں نے مرے ہاتھوں سے کچھ مانگا ہے
کس کے خوابوں نے مرے خوابوں سے کچھ مانگا ہے
دل مچلنے لگا، آنچل میں دھنک جاگ اُٹھی



بچّو! تم تقدیر ہو کل کے ہندوستان کی
باپو کے درداں کی نہرو کے ارمان کی
آج کے ٹوٹے کھنڈروں پر تم کل کا دیش بساؤ گے
جو ہم لوگوں سے نہ ہوا، وہ تم کر کے دکھلاؤ گے
تم ننھی بنیادیں ہو، دُنیا کے نئے ودھان کی
بچّو! تم تقدیر ہو کل کے ہندوستان کی
جو صدیوں کے بعد ملی ہے وہ آزادی کھوئے نا
دین دھرم کے نام پہ کوئی بیج پھوٹ کا بوئے نا
ہر مذہب سے اونچی ہے قیمت انسانی جان کی
بچّو! تم تقدیر ہو کل کے ہندوستان کی

پھر کوئی جے چند نہ اُبھرے، پھر کوئی جعفر نہ اُٹھے
غیروں کا دل خوش کرنے کو اپنوں پہ خنجر نہ اُٹھے
دھن دولت کے لالچ میں توہین نہ ہو ایمان کی
بچّو! تم تقدیر ہو کل کے ہندوستان کی!

بہت دنوں تک اس دُنیا میں ریت رہی ہے جنگوں کی
لڑی ہیں دھن والوں کی خاطر فوجیں بھوکے ننگوں کی
کوئی لٹیرا لے نہ سکے اب قربانی انسان کی
بچّو! تم تقدیر ہو کل کے ہندوستان کی

رہ نہ سکے اب اس دُنیا میں یگ سرمایہ داری کا
تم کو جھنڈا لہرانا ہے محنت کی سرداری کا
ہل ہوں اب مزدوروں کے اور کھیتی ہو دہقان کی
بچّو! تم تقدیر ہو کل کے ہندوستان کی!



تو ہندو بنے گا، نہ مسلمان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا
اچھا ہے ابھی تک ترا کچھ نام نہیں ہے
تجھ کو کسی مذہب سے کوئی کام نہیں ہے
جس علم نے انسانوں کو تقسیم کیا ہے
اس علم کا تجھ پر کوئی الزام نہیں ہے
تو بدلے ہوئے وقت کی پہچان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا
مالک نے ہر انسان کو انسان بنایا
ہم نے اسے ہندو یا مسلمان بنایا
قدرت نے تو بخشی تھی ہمیں ایک ہی دھرتی
ہم نے کہیں بھارت کہیں ایران بنایا
جو توڑ دے ہر بند وہ طوفان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

نفرت جو سکھائے وہ دھرم تیرا نہیں ہے
انساں کو جو روندے وہ قدم تیرا نہیں ہے
قرآن نہ ہو جس میں وہ مندر نہیں تیرا
گیتا نہ ہو جس میں وہ حرم تیرا نہیں ہے
تو امن کا اور صلح کا اعلان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

یہ دین کے تاجر یہ وطن بیچنے والے
انسانوں کی لاشوں کے کفن بیچنے والے
یہ محلوں میں بیٹھے ہوئے قاتل یہ لٹیرے
کانٹوں کے عوض روحِ چمن بیچنے والے
تو اِن کے لیے موت کا اعلان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا



میں نے شاید تمھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے
اجنبی سی ہو مگر غیر نہیں لگتی ہو
وہم سے بھی جو ہو نازک وہ یقیں لگتی ہو
ہائے یہ پھول سا چہرہ یہ گھنیری زلفیں
میرے شعروں سے بھی تم مجھ کو حسیں لگتی ہو
دیکھ کر تم کو کسی رات کی یاد آتی ہے
ایک خاموش ملاقات کی یاد آتی ہے
ذہن میں حسن کی ٹھنڈک کا اثر جاگتا ہے
آنچ دیتی ہوئی برسات کی یاد آتی ہے
میری آنکھوں پہ جھکی رہتی ہیں پلکیں جن کی
تم وہی میرے خیالوں کی پری ہو کہ نہیں
کہیں پہلے کی طرح پھر تو نہ کھو جاؤ گی
جو ہمیشہ کے لیے ہو وہ خوشی ہو کہ نہیں
میں نے شاید تمھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے



زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات
ایک انجان حسینہ سے ملاقات کی رات
ہائے وہ ریشمیں زلفوں سے برستا پانی
پھول سے گالوں پہ رُکنے کو ترستا پانی
دل میں طوفان اُٹھاتے ہوئے جذبات کی رات
زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات
ڈر کے بجلی سے اچانک وہ لپٹنا اُس کا
اور پھر شرم سے بل کھا کے سمٹنا اُس کا
کبھی دیکھی نہ سُنی ایسی طلسمات کی رات
زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات
سُرخ آنچل کو دبا کر جو نچوڑا اُس نے
دل پہ جلتا ہوا اک تیر سا چھوڑا اُس نے
آگ پانی میں لگاتے ہوئے حالات کی رات
زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات
میرے نغموں میں جو بستی ہے وہ تصویر تھی وہ
نوجوانی کے حسیں خواب کی تعبیر تھی وہ
آسمانوں سے اُتر آئی تھی جو رات کی رات
زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات



مَیں زندگی کا ساتھ نبھاتا چلا گیا
ہر فکر کو دھوئیں میں اُڑاتا چلا گیا
بربادیوں کا سوگ منانا فضول تھا
بربادیوں کا جشن مناتا چلا گیا
جو مِل گیا اُسی کو مقدر سمجھ گیا
جو کھو گیا مَیں اُس کو بھُلاتا چلا گیا
غم اور خوشی میں فرق نہ محسوس ہو جہاں
مَیں دل کو اس مقام پہ لاتا چلا گیا

○

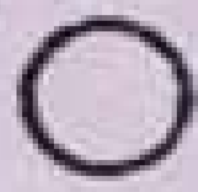
کبھی خود پہ کبھی حالات پہ رونا آیا
بات نکلی تو ہر اک بات پہ رونا آیا
ہم تو سمجھے تھے کہ ہم بھول گئے ہیں ان کو
کیا ہوا آج یہ کس بات پہ رونا آیا
کس لیے جیتے ہیں ہم کس کے لیے جیتے ہیں
بارہا ایسے سوالات پہ رونا آیا
کون روتا ہے کسی اور کی خاطر اے دوست
سب کو اپنی ہی کسی بات پہ رونا آیا



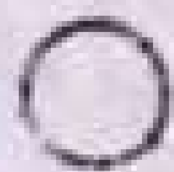
دو بوندیں ساون کی
اک ساگر کی سیپ میں ٹپکے اور موتی بن جائے
دوجی گندے جل میں گر کر اپنا آپ گنوائے
کس کو مجرم سمجھے کوئی، کس کو دوش لگائے
دو بوندیں ساون کی

دو کلیاں گلشن کی
اک سہرے کے بیچ گندھے اور من ہی من اترائے
اک ارتھی کی بھینٹ چڑھے اور دھولی میں مل جائے
کس کو مجرم سمجھے کوئی کس کو دوش لگائے
دو کلیاں گلشن کی

دو سکھیاں بچپن کی
اک سنگھاسن پر بیٹھے اور روپ متی کہلائے
دوجی اپنے روپ کے کارن گلیوں میں بک جائے
کس کو مجرم سمجھے کوئی، کس کو دوش لگائے
دو سکھیاں بچپن کی



رات بھر کا ہے مہماں اندھیرا
کس کے روکے رُکا ہے سویرا
رات جتنی بھی سنگین ہوگی
صبح اتنی ہی رنگین ہوگی
غم نہ کر گر ہے بادل گھنیرا
کس کے روکے رُکا ہے سویرا
لب پہ شکوہ نہ لا، اشک پی لے
جس طرح بھی ہو کچھ دیر جی لے
اب اُکھڑنے کو ہے غم کا ڈیرا
کس کے روکے رُکا ہے سویرا
یوں ہی دُنیا میں آ کر نہ جانا
صرف آنسو بہا کر نہ جانا
مُسکراہٹ پہ بھی حق ہے تیرا
کس کے روکے رُکا ہے سویرا



جو بات تجھ میں ہے تری تصویر میں نہیں
رنگوں میں ترا عکس ڈھلا تو نہ ڈھل سکی
سانسوں کی آنچ جسم کی خوشبو نہ ڈھل سکی
تجھ میں جو لوچ ہے مری تحریر میں نہیں
بے جان حُسن میں کہاں رفتار کی ادا
انکار کی ادا ہے نہ اقرار کی ادا
کوئی لچک بھی زلفِ گرہ گیر میں نہیں
دُنیا میں کوئی چیز نہیں ہے تری طرح
پھر ایک بار سامنے آ جا کسی طرح
کیا اور اک جھلک مری تقدیر میں نہیں



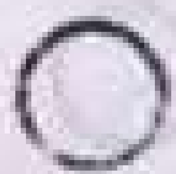
پاؤں چھو لینے دو پھولوں کو عنایت ہوگی
ورنہ ہم کو نہیں، ان کو بھی شکایت ہوگی

آپ جو پھول بچھائیں اُنھیں ہم ٹھکرائیں
ہم کو ڈر ہے کہ یہ توہینِ محبت ہوگی

دل کی بے چین اُمنگوں پہ کرم فرماؤ
اتنا رُک رُک کے چلوگی تو قیامت ہوگی

شرم روکے ہے اِدھر، شوق اُدھر کھینچے ہے
کیا خبر تھی کبھی اس دل کی یہ حالت ہوگی

شرم غیروں سے ہوا کرتی ہے اپنوں سے نہیں
شرم ہم سے بھی کروگی تو مصیبت ہوگی



یہ وادیاں، یہ فضائیں بُلا رہی ہیں تمھیں
خموشیوں کی صدائیں بُلا رہی ہیں تمھیں

ترس رہے ہیں جواں پھول ہونٹ چھونے کو
مچل مچل کے ہوائیں بُلا رہی ہیں تمھیں

تمھاری زلفوں سے خوشبو کی بھیک لینے کو
جھکی جھکی سی گھٹائیں بُلا رہی ہیں تمھیں

حسین چمپئی پیروں کو جب سے دیکھا ہے
ندی کی مست ادائیں بُلا رہی ہیں تمھیں

مرا کہا نہ سنو ان کی بات تو سن لو
ہر ایک دل کی دعائیں بُلا رہی ہیں تمھیں



سلامِ حسرت قبول کر لو
مری محبت قبول کر لو

اُداس نظریں تڑپ تڑپ کر تمھارے جلووں کو ڈھونڈتی ہیں
جو خواب کی طرح کھو گئے اُن حسین لمحوں کو ڈھونڈتی ہیں
اگر نہ ہو ناگوار تم کو، تو یہ شکایت قبول کر لو
مری محبت قبول کر لو

تمھی نگاہوں کی آرزو ہو تمھی خیالوں کا مدعا ہو
تمھی مرے واسطے صنم ہو، تمھی مرے واسطے خدا ہو
مری پرستش کی لاج رکھ لو مری عبادت قبول کر لو
مری محبت قبول کر لو

تمھاری جھکتی نظر سے جب تک نہ کوئی پیغام مل سکے گا
نہ روح تسکین پا سکے گی، نہ دل کو آرام مل سکے گا
غمِ جدائی ہے جان لیوا، یہ اک حقیقت قبول کر لو
مری محبت قبول کر لو



تم اگر مجھ کو نہ چاہو تو کوئی بات نہیں
تم کسی اور کو چاہو گی تو مشکل ہوگی

اب اگر میل نہیں ہے تو جدائی بھی نہیں
بات توڑی بھی نہیں تم نے بنائی بھی نہیں
یہ سہارا ابھی بہت ہے مرے جینے کے لیے
تم اگر میری نہیں ہو تو پرائی بھی نہیں
میرے دل کو نہ سراہو تو کوئی بات نہیں
غیر کے دل کو سراہو گی تو مشکل ہوگی

تم حسیں ہو تمھیں سب پیار ہی کرتے ہوں گے
میں جو مرتا ہوں تو کیا اور بھی مرتے ہوں گے
سب کی آنکھوں میں اسی شوق کا طوفاں ہوگا
سب کے سینے میں یہی درد ابھرتے ہوں گے
میرے غم میں نہ کراہو تو کوئی بات نہیں
اور کے غم میں کراہو گی تو مشکل ہوگی

پھول کی طرح ہنسو سب کی نگاہوں میں رہو
اپنی معصوم جوانی کی پناہوں میں رہو
مجھ کو وہ دن نہ دکھانا تمھیں اپنی ہی قسم
میں ترستا رہوں تم غیر کی باہوں میں رہو
تم جو مجھ سے نہ نباہو تو کوئی بات نہیں
کسی دشمن سے نباہو گی تو مشکل ہوگی



یہ محلوں، یہ تختوں، یہ تاجوں کی دُنیا
یہ انساں کے دشمن سماجوں کی دُنیا
یہ دولت کے بھوکے رواجوں کی دُنیا
یہ دُنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے؟

ہر اک جسم گھائل، ہر اک رُوح پیاسی
نگاہوں میں اُلجھن، دلوں میں اُداسی
یہ دُنیا ہے یا عالمِ بدحواسی!
یہ دُنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے؟

یہاں اک کھلونا ہے انساں کی ہستی
یہ بستی ہے مُردہ پرستوں کی بستی
یہاں پر تو جیون سے ہے موت سستی
یہ دُنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے؟

جوانی بھٹکتی ہے بدکار بن کر
جواں جسم سجتے ہیں بازار بن کر
یہاں پیار ہوتا ہے بیوپار بن کر
یہ دُنیا اگر مِل بھی جائے تو کیا ہے؟

یہ دُنیا، جہاں آدمی کچھ نہیں ہے
وفا کچھ نہیں دوستی کچھ نہیں ہے
جہاں پیار کی قدر ہی کچھ نہیں ہے
یہ دُنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے؟

جلا دو اسے پھونک ڈالو یہ دُنیا
مرے سامنے سے ہٹا لو یہ دُنیا
تمھاری ہے تم ہی سنبھالو یہ دُنیا
یہ دُنیا اگر مِل بھی جائے تو کیا ہے؟



سب میں شامل ہو مگر سب سے جُدا لگتی ہو
صرف ہم سے نہیں خود سے بھی خفا لگتی ہو

آنکھ اُٹھتی ہے نہ جھکتی ہے کسی کی خاطر
سانس چڑھتی ہے نہ رُکتی ہے کسی کی خاطر
جو کسی در پہ نہ ٹھہرے وہ ہوا لگتی ہو

زلف لہرائے تو آنچل میں چھپا لیتی ہو
ہونٹ تھرائے تو دانتوں میں دبا لیتی ہو
جو کبھی کھُل کے نہ برسے وہ گھٹا لگتی ہو

جاگی جاگی نظر آتی ہو نہ سوئی سوئی
تم جو ہو اپنے خیالات میں کھوئی کھوئی
کسی مایوس مصوّر کی دعا لگتی ہو



تم چلی جاؤ گی پرچھائیاں رہ جائیں گی
کچھ نہ کچھ حُسن کی رعنائیاں رہ جائیں گی

تم کہ اس جھیل کے ساحل پہ ملی ہو مجھ سے
جب بھی دیکھوں گا یہیں مجھ کو نظر آؤ گی
یاد مٹتی ہے نہ منظر کوئی مٹ سکتا ہے
دُور جا کر بھی تم اپنے کو یہیں پاؤ گی

اس دھڑکتی ہوئی شاداب حسیں وادی میں
یوں نہ سمجھو کہ ذرا دیر کا قصّہ ہو تم
اب ہمیشہ کے لیے میرے مقدّر کی طرح
ان نظاروں کے مقدّر کا بھی حصّہ ہو تم
تم چلی جاؤ گی پرچھائیاں رہ جائیں گی
کچھ نہ کچھ حُسن کی رعنائیاں رہ جائیں گی



مَیں پل دو پل کا شاعر ہوں
پل دو پل میری کہانی ہے
پل دو پل میری ہستی ہے
پل دو پل میری جوانی ہے

مُجھ سے پہلے کتنے شاعر
آئے اور آکر چلے گئے
کچھ آہیں بھر کر لوٹ گئے
کچھ نغمے گا کر چلے گئے
وہ بھی اک پل کا قصّہ تھے
مَیں بھی اک پل کا قصّہ ہوں
کل تم سے جُدا ہو جاؤں گا
گو آج تمھارا حصّہ ہوں
مَیں پل دو پل کا شاعر ہوں!

کل اور آئیں گے نغموں کی
کھِلتی کلیاں چُننے والے
مجھ سے بہتر کہنے والے
تم سے بہتر سُننے والے
کل مجھ کو کوئی یاد کرے
کیوں مجھ کو کوئی یاد کرے
مصروف زمانہ میرے لیے
کیوں وقت اپنا برباد کرے

مَیں پل دو پل کا شاعر ہوں
پَل دو پَل میری کہانی ہے
پَل دو پَل میری ہستی ہے
پَل دو پَل میری جوانی ہے



ایشور اللہ تیرے نام!
سب کو سنمتی دے بھگوان

اس دھرتی پر بسنے والے
سب ہیں تیری گود کے پالے
کوئی نیچ نہ کوئی مہان
سب کو سنمتی دے بھگوان

جنم کا کوئی مول نہیں ہے
جنم منش کا تول نہیں ہے
کرم سے ہے سب کی پہچان
سب کو سنمتی دے بھگوان



پربتوں کے پیڑوں پر شام کا بسیرا ہے
سُرمئی اُجالا ہے، چمپئی اندھیرا ہے

دونوں وقت ملتے ہیں دو دلوں کی صورت سے
آسماں نے خوش ہو کر رنگ سا بکھیرا ہے

ٹھہرے ٹھہرے پانی میں گیت سرسراتے ہیں
بھیگے بھیگے جھونکوں میں خوشبوؤں کا ڈیرا ہے

کیوں نہ جذب ہو جائیں اس حسیں نظارے میں
روشنی کا جھرمٹ ہے مستیوں کا گھیرا ہے



کسی پتھر کی مورت سے محبت کا ارادہ ہے
پرستش کی تمنا ہے، عبادت کا ارادہ ہے

جو دل کی دھڑکنیں سمجھے نہ آنکھوں کی زباں سمجھے
نظر کی گفتگو سمجھے نہ جذبوں کا بیاں سمجھے
اُسی کے سامنے اس کی شکایت کا ارادہ ہے

سُنا ہے ہر جواں پتھر کے دل میں آگ ہوتی ہے
مگر جب تک نہ چھیڑو شرم کے پردے میں سوتی ہے
یہ سوچا ہے کہ دل کی بات اس کے روبرو کہہ دیں
نتیجہ کچھ بھی نکلے آج اپنی آرزو کہہ دیں
ہر اک بے جا تکلف سے بغاوت کا ارادہ ہے

محبت بے رُخی سے اور بھڑکے گی وہ کیا جانے
طبیعت اس ادا پر اور پھڑکے گی وہ کیا جانے
وہ کیا جانے کہ اپنا کس قیامت کا ارادہ ہے
کسی پتھر کی مورت سے محبت کا ارادہ ہے



تیرا من درپن کہلائے
بھلے بُرے سارے کرموں کو دیکھے اور دکھائے

من ہی دیوتا، من ہی ایشور، من سے بڑا نہ کوئے
من اُجیارا جب جب پھیلے، جگ اُجیارا ہوئے
اس اُجلے درپن پہ پرانی دھول نہ جمنے پائے

سُکھ کی کلیاں دُکھ کے کانٹے من سب کا آدھار
من سے کوئی بات چھپے نا، من کے نین ہزار
جگ سے چاہے بھاگ لے کوئی من سے بھاگ نہ پائے

تن کی دولت ڈھلتی چھایا، من کا دھن انمول
تن کے کارن من کے دھن کو مت ماٹی میں رول
من کی قدر بھلانے والا ہیرا جنم گنوائے
تیرا من درپن کہلائے